اُدھار کی زندگی
ہرچند کوشک

ادھار کی زندگی

(افسانے)

•

مہر چند کوشک

•

۱۷۷۹۔ کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ (انڈیا)

کتاب : اُدھار کی زندگی

مصنف : مہرچند کوشک

پتہ : ۹/۱۵-۲۱۴ بی سی بازار، انبالہ چھاؤنی (پنجاب)

اشاعت : اُنیس سو ترانوے (۱۹۹۳ء)

قیمت : پچاس روپے Rs. 50/=

ناشر : انیس امروہوی

● تخلیق کار پبلشرز، ۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اہتمام : سکریٹری انبالہ ساہتیہ منچ، ۹/۱۵-۲۱۴ بی سی بازار انبالہ چھاؤنی (پنجاب)

خوش نویس : سلیم اختر چنڈی گڑھ

سرورق : ساجد

مطبوعہ : پلس آفسیٹ پرنٹنگ ورکس ۹، ۲۵ تراہا بہرام خان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

● گرین پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، ۲۱۱۔ دہلی چیمبرس بلڈنگ، دہلی گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

● ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، دہلی ۱۱۰۰۰۶

● الهلوواليہ بکڈپو، ۹۹۸۸/۴۹۔ نیو روہتک روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵

● موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ۹۔ گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● ترشول ہٹ، ۱۵۔ بی، راجہ پارک، انبالہ کینٹ (پنجاب)

● انبالہ ساہتیہ منچ، ۹/۱۵-۲۱۴ بی سی بازار، انبالہ چھاؤنی (پنجاب)

T.P. : 019 — Rs. 50.00
KAUSHIK MEHAR CHAND — 1993
UDHAR KI ZINDAGI (Short Stories)
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS,
1779-KUCHA DAKHNI RAI,
DARYA GANJ, NEW DELHI-110002

اُن مزدور بچّوں کے نام جن کا
بچپن پیٹ کی خاطر بکھر گیا

مہر چند کوشک

فہرست

کچھ اپنی بات

میرے جنم کے ساتھ بھوک نے بھی جنم لیا تھا۔ بچپن ہی میں والدین کے لاڈ پیار اور سہارے سے محروم ہوگیا۔ اور جب جوانی آئی تو محرومیوں، مایوسیوں اور اداسیوں کے جھمیلے رہے ساتھ۔ بس زندگی کے تلخ حقائق نے جینا سکھا دیا۔ اور میرا وشواس مضبوط تر ہوتا چلا گیا کہ پتھر بھی پھول کھلائیں گے

مُلک کے بٹوارے سے پہلے ہی ادب سے لگاؤ تھا۔ دیش کے نامور افسانہ نگاروں کی تخلیقات سے متاثر ہوکر لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ افسانہ/ کہانی ذہنی غذا اور زندگی کی بنیاد ہے۔ اس میں ہم اپنا عکس دیکھتے ہیں، شعر میں تخیل۔ ادب وقت اور ماحول کا آئینہ ہے اور اُس کا تعلق انسان سے ہے۔ اور حقیقت نگاری کے امکانات شاعری کے مقابلے میں نثر میں زیادہ ہیں۔ افسانہ جو ادب کی اہم صنف ہے انسان کو کبھی مایوس نہیں کرے گا۔ کیونکہ اُردو افسانے کے ضمیر میں اس مُلک کی بُو باس ہے جو بہت عظیم ہے اور جس کی دھرتی پر رگ وید سے لے کر آج کے ایٹمی دور کے انسان کے قدموں کے شوخ اور مضبوط نقوش ہیں۔

مانتا ہوں کہ جنس نہایت پُرکشش اور انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا جزو ہے، لیکن سے "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" کو بھی ہرگز نہیں بُھلایا جاسکتا۔

ہم لوگوں کی خوشیاں یکساں ہوسکتی ہیں، لیکن دُکھ درد جُدا جُدا ہوتے

ہیں۔ کہانی کار الفاظ کے ذریعے اپنے اس کرب کو نمایاں کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کہانی کار اپنے لئے ہی تخلیق کرتا ہے۔ لیکن جب یہ تخلیق شائع ہو کر عوام کے پاس پہونچتی ہے تو وہ اُن کی بن جاتی ہے۔ وہ چاہے اس کی سراہنا کریں یا ناپسند.........اس میں فنی غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ میں بھی تو عوام میں سے ہوں۔

میں سادگی کا قائل ہوں۔ لہذا زبان اور انداز میں سادگی اختیار کی ہے تاکہ سڑک کا عام آدمی بھی بخوبی سمجھ سکے۔

میرا پہلا افسانہ "آہوں کی پکار"، ماہنامہ "نرالا"، اگست ۱۹۴۸ء کے شمارے میں شائع ہوا.....اور پھر دیش کے مختلف رسالوں میں باقاعدگی سے شائع ہونے لگا۔

میں جناب صابر ابوہری صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں، جنہوں نے میرے اس افسانوی مجموعے پر اپنے گراں قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

میں اپنے ان ادیب دوستوں کا بھی ممنون ہوں، جنہوں نے اس مجموعے کو شائع کرنے میں میری رہنمائی کی اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

—— مہر چند کوشک

●●

پیش لفظ

"اُدھار کی زندگی" جناب مہر چند کوشک کے ۱۶ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان کا شمار شمالی ہند کے کامیاب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور ان کی تخلیقات پچھلے ۴۰ سال سے مُلک کے برگزیدہ رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اُردو افسانوی ادب کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے کے لئے ہریانہ اُردو اکادمی نے انہیں پچھلے سال اعزاز بھی عطا کیا تھا۔

کوشک صاحب اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے افسانے لکھتے رہے ہیں ان کی ابتدائی کہانیاں ان کے کالج کے میگزین اور مقامی رسالوں میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ انھوں نے آجتک کتنے ہی افسانے لکھے جو شائع بھی ہوئے، مگر ان کی لاابالی طبیعت کے سبب ان میں سے چند ایک ہی محفوظ رہ سکے جنہیں اب یہ کتابی رُوپ دے رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہریانہ ساہتیہ اکادمی اور ہریانہ اُردو اکادمی کے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے منتخب افسانوی مجموعوں میں شامل کئے جا چکے ہیں۔

اگرچہ کسبِ معاش کے لئے، اُن کو محکمہ ڈاک تار کے حساب کتاب کے شعبے میں ملازمت کرنا پڑی لیکن انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ انھوں نے یہ کام کچھ تو اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعے انجام دیا اور کچھ مختلف موضوعات کا گہرا مطالعہ کرکے۔ یاد رہے کہ انھوں نے تین مضامین میں ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ کارزارِ حیات کے

اس مطالعے کے دوران انہیں جہاں کوئی خامی نظر آئی یا حل طلب مسئلہ سامنے آیا اس کی نشاندہی کے لیے یہ اپنی افسانہ نگاری کی اسی صلاحیت کو بروئے کار لے آئے۔ اس سلسلے میں یہ منشی پریم چند کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے ایک بار کہا تھا "میں کہانیاں اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہوں۔ کوئی چیز دیکھوں جس میں اصلاح کا پہلو نظر آیا تو کہانی لکھ ڈالی۔"

انھوں نے اپنے افسانوں میں سماج میں موجود متعدد برائیوں کو بے نقاب کیا ہے اور مسائل کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کروائی ہے۔ ہمارے ہندوسماج میں خاص طور پر جہیز کے مسئلہ نے خطرناک صورت اختیار کرلی ہے جس کے سبب متوسط گھرانوں کی لڑکیوں کی شادی کے بارے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شادی کے ناقابل برداشت اخراجات کے پیش نظر لڑکی کا باپ رشوت ستانی منافع خوری، چوربازاری، تجارتی بددیانتی کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ اور دھوکے بازی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی کچھ ایک شادیوں کا انجام دلہن کی مسلسل اذیت اور قتل ایسا ہولناک حادثہ ہوتا ہے۔ مصنف نے "سرمئی چاند" اور "مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔" میں اس سلسلے پر مؤثر ڈھنگ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ جس سے آج ہمارا دیش دوچار ہے، غریبی کا ہے پچاس سال کی آزادی کے بعد بھی اکثر لوگ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں جن کے پاس رہنے کو مکان ہے نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا کسی کسی کو تو دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی جس سے بقول ولی دکنی نہ تو مرد کا وقار قائم رہتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی اعتبار کرتا ہے۔ ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کوشک صاحب نے اس مسئلے کو بھی "پیٹ کی خاطر" اور "ادھار کی زندگی" میں

اپنی کہانی کا موضوع بنایا ہے۔

ایک اور بات جس کو مصنف نے عصمت چغتائی کی طرح اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، وہ ہے عورت کا مقام و مرتبہ۔ ہمہ جہت ترقی کے باوجود آج بھی ہمارے سماج میں ایک عام عورت کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جس کی وہ حقدار ہے، لڑکوں کو آج بھی لڑکیوں پر برتری حاصل ہے۔ اور مرد عورت کو خود سے کمتر سمجھتا ہے۔ اسی لیے، وہ اُسے اپنی ہوس کا آلۂ کار بناتا ہے، اس کی عصمت دری کرتا ہے، اسے فروخت کرتا ہے، بیوگی کی صورت میں اُسے دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتا اور پھر اس کی بیچارگی کا ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اقتصادی کمزوری کے سبب اسے جسم فروشی پر مجبور کرتا ہے اور اسے ہر طرح کی سیاسی اور سماجی سہولیات سے محروم کر دیتا ہے۔ ترقی اور نجات کے تمام راستے اس پر بند کر دیتا ہے۔ اس موضوع پر مصنف نے "اور وہ روتی رہی"، "گومتی کے کنارے" اور "پیٹ کی خاطر" جیسے عمدہ افسانے لکھے ہیں۔

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ زندگی صرف مسائل اور مشکلات کا نام ہے یا بقول تھامس ہارڈی غم واندوہ کی ہی بھرمار ہے۔ زندگی میں راحت وسکون بھی ہے اور عیش وطرب بھی۔ اُس کا دامن مسرت وانبساط سے بھی مالامال ہے۔ اس میں کیف ومستی بھی ہے اور رقص وموسیقی بھی۔ اس لیے اگر کوئی فنکار فانی بدایونی کی طرح زندگی کے صرف مسائل سے بھرپور تاریک پہلو کی ہی عکاسی کرتا ہے تو وہ سچا فنکار نہیں ہے۔ وہ نہ تو زندگی کے ساتھ انصاف کرتا ہے اور نہ ہی فن کے ساتھ۔ کوشک بھی اسی نکتے سے کماحقہ، واقف ہیں۔ اسی لئے انھوں نے "ٹھنڈی آگ"، اور "پریم پجارن" ایسے رومانی اور طرب آمیز افسانے تخلیق کئے ہیں۔

تکنیک کے نقطۂ نظر سے بھی جناب کوشک کے افسانے ہر طرح سے کامیاب ہیں۔ ان میں دلچسپ آغاز ہے، حرکت ہے، کلائمکس ہے، سسپنس ہے اور فنکارانہ اختتام

بھی۔ ان کے کردار کسی خیالی دُنیا کے باشندے نہیں بلکہ ہمارے ہی کرۂ ارض پر رہنے والے گوشت پوست کے عام انسان ہیں۔ "دُھار کی زندگی" والا منگلو مزدور "پریم پجارن" والے مدن اور سروج "ٹھنڈی آگ" والے نرملا اور راجن اور "کھوٹا سکہ" والے دھنو اور کالو آپ کو اپنے ہی شہر میں بہ کثرت مل جائیں گے۔

افسانوں کی زبان بھی آسان اور عام فہم ہے، بناوٹ اور تصنع سے یکسر عاری انھوں نے اسے رنگین بنانے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ جیسے کردار ہیں ویسی ہی اُن کی زبان ہے، سیدھی سادی، بے تکلف۔ جیسے جیسے خیالات وارد ہوتے گئے یہ اُنہیں ویسے ہی رقم کرتے گئے، خلوص اور ایمانداری کے ساتھ، نہ بناوٹ، نہ سجاوٹ، نہ تصنع نہ دکھاوا۔ آرٹ کو نمائش سے محفوظ رکھنا بھی ایک آرٹ ہے۔ ان کے افسانے فکشن ہوتے ہوئے بھی سچی اور حقیقی داستانیں لگتے ہیں۔

ان کی یہ کاوش ہر لحاظ سے لائق تحسین ہے اور ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائیگی لیکن ہم یہ بھی امید کرتے ہیں کہ مصنّف اس کامیابی کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے گا اور پہلے کی طرح خُوب سے خُوب تر کی جستجو میں رواں دواں رہے گا۔

بیسویں صدی میں اُردو کے افسانہ نگاروں نے سماجی بیداری، حُب الوطنی کے فروغ اور عوام کے شعوُر کی تہذیب و تربیت کے لیے اہم رول ادا کیا ہے۔ ان میں منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہریانہ کے کشمیری لال ذاکر، ستیش بترا ہیرانند سوز، اوم کرشن راحت، ملکھی رام کشان، اوم پرکاش لاغر، سلطان انجم، سدرشن دیپ اور خود مہر چند کوشک اسی سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ اور اُن کا یہ افسانوی مجموعہ افسانوی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

——— صابر ابوہری

ایگرو کنکز، کورٹ روڈ
جگادھری

۱۴ر فروری ۱۹۹۳ء

ہندوستانی ہونے کا فخر

یہ اُن دِنوں کا واقعہ ہے جب دوسری عالمگیر جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ فوجی اسپیشل ٹرین آنے کی وجہ سے ہمارا اسٹیل پلیٹ فارم نمبر ۳ پر لگا ہوا تھا۔ جونہی اسپیشل گاڑی پلیٹ فارم نمبر ا پر ٹھہری، ایک ہل چل سی مچ گئی۔ اسی اثناء میں ایک انگریز افسر گاڑی سے اُترا، اور پُرمعنی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دفعتاً سات آٹھ سالہ ایک بچے نے اسے گھیر لیا۔ اس کی قمیض پھٹی ہوئی اور پاؤں سے ننگا تھا۔ اس اس کا پچکڑا ہوا سا چہرہ، بال بکھرے ہوئے تھے۔ خشک ہونٹ اور اُجڑی اُجڑی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ اس نے غریبی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ وقت کا ستایا ہوا، فاقوں کا مارا ہوا اور دکھوں کا جھنجھوڑا ہوا تھا۔ خوبصورتی تو تھی ..... پر بچپن نہ تھا۔ کھیلنے کھانے کے بچپن کے دن روزی روٹی کمانے کی جدوجہد میں گزر رہے تھے .... اس کے پاس صرف ایک چھوٹا سا کپڑے کا تھیلا تھا۔

" شاب ..... شاب، بوٹ پالش کرواؤ گے ؟ بہت اچھی پالش کرونگا۔ صرف چار آنے میں ..... ایکدم نیا بن جائے گا ..... !"

انگریزی افسر کو بڑا آدمی سمجھ کر ہی بچے نے شاید پہلی بار چونی اُجرت کی مانگی تھی وہ بھی ڈرتے، ڈرتے ..... !

" ٹھیک ہے، ٹھیک ..... جلدی کرو ..... !" رحم دکھاتے ہوئے انگریز نے اکڑ کر کہا ..... اور مزدور بچہ اپنے کام میں جٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد انگریز نے ایک روپے کا سکہ زمین پر پھینک دیا۔ بچے نے چمکدار سکّے کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا، اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں ..... اور اپنا تھیلا

سنبھال کر بھیڑ میں کھو گیا ..... فرنگی دیکھتا رہ گیا .... اور پھر فوراً چھلانگ لگا کر
وہ اپنے ڈبہ میں جا بیٹھا۔ سگریٹ سلگا کر کھڑکی کی راہ دھواں پھینکتے ہوتے، باہر لوگوں
کی بھیڑ کو دیکھنے لگا۔ اس کی تیکھی نگاہیں کچھ ، کرید رہی تھیں .... شاید وہ اپنے
باقی پیسوں کے لئے اس بچے کا انتظار کر رہا تھا .... اس نے سوچا کہ ہندوستانی
بے ایمان ہوتے ہیں۔ ایک روپیہ ملتے ہی چکمہ دے کر دیکھتے ہی دیکھتے رفوچکر ہو گیا۔
..... اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی اور چل دی.... لیکن تھوڑی ہی دور جا کر ایک جھٹکے
کے ساتھ رک گئی۔ باہر شور مچ گیا۔ پلیٹ فارم کے سرے پر لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تھی
انگریز افسر بھی ڈبہ سے نیچے اترا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا .... اور دیکھا کہ ایک
لڑکا کچلا ہوا خون میں لت پت پڑا سسک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھٹا ہوا چھوٹا
سا تھیلا تھا، اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی بند تھی .... فرنگی کو سامنے دیکھتے ہی اس نے اپنی
مٹھی کھول دی .... پورے بارہ آنے تھے .... اور دوسرے ہی لمحہ اس کی آنکھیں پتھرا
گئیں .....! ایک شخص کہہ رہا تھا .... بے چارہ گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا چلا آ
رہا تھا .... "شاب .... باقی پیسے ..... شاب لو پیسے .....!" اور پھر اچانک پاؤں پھسلا
اور جھٹ گاڑی کے نیچے ..... لیکن واہ رے سپوت، جان دے دی مگر ایمانداری
کو دھبّہ نہیں لگنے دیا .....!!

●●

بے آواز ارتھی

ہوا طیش میں آئے ہوئے کالے ناگ کی طرح پھنکار رہی تھی۔ اندھیرے نے اپنے کالے کلوٹے اور ڈراؤنے جبڑے چاروں طرف پھیلا رکھے تھے۔ رات کسی بیوہ کے مستقبل کی مانند بھیانک تھی بارش برس کر تھم جاتی۔ اور پھر پورے زور سے پانی گرنے لگتا۔ ہوا کی چیخ اور بارش کا شور سکوت میں لرزش پیدا کر رہا تھا۔ ایک ٹمٹماتی لالٹین چند آدمیوں کو شمشان بھومی کا راستہ دکھا رہی تھی۔ مشکل سے سات آٹھ آدمی ہوں گے۔ چار آدمیوں کے کندھوں پر ایک ارتھی تھی۔ وہ سب بالکل خاموش جلدی جلدی شمشان بھومی کی طرف لپک رہے تھے۔ شاید مرنے والے کا کوئی رونے والا نہ تھا۔

شمشان بھومی میں خوفناک ماتمی سیاہی کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ درختوں کے پتوں کا بھیانک شور اور چیخیں شمشان بھومی کی فضا کو دہشت زدہ بنا رہی تھیں۔ ارتھی کو ٹین کی چھت تلے رکھ کر ایک شخص نے زور سے پکارا ــــ "کوئی ہے..... ارے کوئی ہے؟"

"کون ہے؟" آواز آئی، جیسے کوئی مردہ ڈر کے مارے چلا اٹھا ہو۔

"یہاں آؤ۔ ہم ایک مردہ لائے ہیں، پھونکنا ہے۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"رات کو بھی کمبخت چین نہیں لینے دیتے......" کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر چند لمحے بعد ایک ڈراؤنی صورت والا مٹھی بھر ہڈیوں کا ڈھانچہ اس مجبوراً جلتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی میں نمودار ہوا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں

اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے کونے گندے پانی سے بھیگے ہوئے تھے جسم کی چمڑی سمٹ کر سوکھی روٹی کے پاپڑ کی طرح ہو گئی تھی۔ اس کا سارا جسم جذبات سے خالی لگتا تھا۔

"کون مر گیا ہے۔؟" بڈھے نے روکھے لہجہ میں پوچھا۔

"ایک لاوارث ہے۔" ایک آدمی نے جواب دیا۔

"لاوارث ہے تو میں کیا کروں۔ جلا دو اسے۔!" بوڑھے نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"جلانے کے لئے سوکھی لکڑیاں درکار ہیں۔ سوکھی لکڑی کسی کے پاس نہیں ملی سارے شہر میں پتہ چلا، کہ صرف تمہارے ہی پاس سے مل سکتی ہیں۔ زیادہ نہیں تو چار من تو دے ہی دو۔"

"لکڑی تو جتنی چاہو لے لو۔ مگر چالیس روپے من سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔ اور بیس روپے میری چوکیداری کے ہوں گے۔ لاوارث لاش کی وجہ سے چالیس روپے من مانگے ہیں، اور کوئی ہوتا تو پچاس روپے سے کوڑی کم نہ ہوتی۔" بڈھے نے ایک عجیب انداز سے کہا۔

"لیکن بھیا! ہم تو کفن بھی چندہ اکٹھا کر کے لائے ہیں، اور تم دوگنی قیمت مانگ رہے ہو۔ اتنے پیسے ہم کہاں سے لائیں۔؟"

"تو پھر کہیں اور سے لے آؤ۔ میں تو یہی بھاؤ دوں گا۔" بڈھے نے جواب دیا۔

"ڈوب کر نہیں مر جاتا تمہارے سے۔" ایک نوجوان آدمی بولا....... کتنے پتھر دل ہو۔ قبر میں تو ٹانگے لٹکائے بیٹھے ہو۔ مگر چاندی کے چند ٹکڑوں کے لئے جان دیتے ہو........ معلوم ہے اس لاوارث شخص کو وقت کے تھپیڑوں نے پائمال کر دیا تھا، اور بھوک نے اس کی جان لے لی۔ تمہیں بھی ایک روز مرنا ہے بابا۔!"

"یہ چاندی کی جھنکار ہی انسان کو ہر مصیبت سے بچاتی ہے۔ بولو بابو، جاؤں کیا۔؟"

"ارے اس کی جواں مرگی پر تو ترس کھاؤ۔" ایک شخص نے بہت متانت سے کہا۔

" ہم بھی کبھی جوان تھے میاں! بادل آرہے ہیں اُمڈ اُمڈ کر۔ بولو کیا صلاح ہے؟"
بڈھا چٹان کی طرح اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔
بادل گرجنے لگا، بجلی چمکنے لگی۔ اور دُور کسی درخت پر اُلو زور سے چلّایا........
ایک نوجوان نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر بڈھے کو دیتے ہوئے کہا ـــــ
"لے پکڑ حریص! بیچ کر پیسے لے لینا' دیکھ تیرے چاروں طرف سونے چاندی والوں کی بستی ہے۔ یہ سب بند مٹھی لے کر آئے تھے اور ہاتھ پسارے چلے گئے۔ دولت اور سرمایہ ان پر مسکرا رہے ہیں۔ لیکن تجھے ہوش تک نہیں آتا۔"
مگر بڈھا بالکل پتھر کی مورتی بنا ہوا تھا۔ انگوٹھی کو تہمد کی گانٹھ میں ٹھونس کر ایک کوٹھڑی کی طرف چل دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین چار آدمی ہولیے۔
کالے کالے بادل تن تن کر آرہے تھے۔ ہوا درخت کے پتّوں سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی، اور قدرت تڑپ کر موٹے موٹے آنسو بہانے لگی۔ لوگوں کی آنکھوں میں نیند کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ سبھی یہ چاہتے تھے کہ جلدی لوٹ جائیں اور آرام کی نیند سوئیں۔ بھلا یہ کیا تھوڑا ہے کہ ایک لاوارث کی مٹّی ٹھیک طرح سے ٹھکانے لگا دی۔
تھوڑی دیر کے بعد چتا تیار ہوگئی۔ ہوا سے کفن ذرا اُٹھ گیا اور لاش کا چہرہ ننگا ہوگیا۔ کتنا معصوم اور بھولا بھالا چہرہ تھا۔ جیسے ابھی مسکراتا ہوا سو گیا ہو۔ بڈھے کی بھی نظر اس چہرہ پر جا پڑی.........اور پھر یکایک وہ چلّا اٹھا۔
"......میرا بچہ لاوارث!" اور دھڑام سے اس لاش پر جا پڑا۔ اور پھر ایک بار گردن ذرا اوپر اٹھا کر چاروں طرف نہ معلوم کیا دیکھا اور پھر.........ایک دردناک چیخ مار کر خاموش ہوگیا
"شاید اس کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔" ایک آدمی نے کہا۔
"نہیں، نہیں۔ یہ ظالم بہانہ بناتا ہے، اگر اولاد والا ہوتا تو دل میں کچھ تو رحم ہوتا۔"

"نہیں، حالات سے مجبور ہو گا۔ اس کا کیا قصور غریب کا۔"

" دیکھو تو بے ہوش ہو گیا ہے۔" ایک شخص نے کہا۔

" نہیں، ختم ہو گیا ہے۔" دوسرے نے نبض دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

" ایک ہی چتا میں دونوں کو جلا دو۔"

" ہاں، بچھڑے ہوئے مل جائیں پھر ایک بار!"

اور پھر تھوڑی دیر بعد چھوٹی چھوٹی چنگاریاں فضا میں ناچنے لگیں۔ فضا مچل رہی تھی، نہ معلوم کیوں قدرت کا دل تڑپ رہا تھا اس غریب کی موت پر۔ اس رات بارش خوب پڑی۔ ایک طوفانی رات تھی وہ۔ کیسا انوکھا ملاپ تھا۔ اور کتنا حسرت ناک انجام۔!

چودھری جے دیو سنگھ مادھو پور گاؤں کے ایک مانے ہوئے رئیس تھے۔ خوب ٹھاٹھ تھے ان کے۔ گاؤں کی آدھی سے زیادہ زمین اور کئی باغات کے مالک تھے۔ نوکر، گھوڑا گاڑی ٹریکٹر، ٹرک و موٹر کار وغیرہ سبھی کچھ تھا ویسے کہنے کو تو پینتالیس برس سے اوپر ہو چکے تھے مگر جسم میں جوانی کی کساوٹ ابھی نظر آتی تھی گوپال اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مگر تھا کچھ آوارہ سا...... ہاں، آوارہ ہی کہہ لیجئے، کیونکہ وہ اکثر گرد و نواح کے دیہات میں کسانوں اور مزدوروں کی پارٹی کے کام میں مشغول رہتا۔ وہ گھر کے کسی کام میں ذرا بھی دلچسپی نہ لیتا۔ اور یہی فکر چودھری صاحب کو کھائے جا رہی تھی کہ اتنی بڑی جائداد کو کون سنبھالے گا۔

...... ، گوپال تو بس ان مزارعوں میں زمین تقسیم کرنے پر ہی تلا ہوا ہے۔

چنانچہ چودھری صاحب نے دوسری شادی کرنے کی ٹھان لی۔ تاکہ ایک تو گوپال کی ماں کی موت کا غم غلط ہو جائے اور دوسرے اگر قدرت کو منظور ہوا، تو اس لمبی چوڑی جائداد کو سنبھالنے والا کوئی حقدار بھی پیدا ہو جائے۔ خیال تو نیک تھا چودھری صاحب کا۔ مگر کون بے وقوف ہو گا جو اس اُتار و عمر والے شخص کے ساتھ اپنی کنواری کنیا بیاہ دے گا۔؟

لیکن صاحب، آپ نہیں جانتے کہ روپے کی جھنکار سب کچھ کروا دیتی ہے۔ پھانسی کے تختے پر سے اُتروا لاتی ہے یہ جھنکار۔ اور پھر گرمٹ کو تو بہتیری مکھیاں چمٹنے کو دوڑتی ہیں..... چنانچہ چودھری صاحب کے ساتھ اپنی لڑکی بیاہ دینے کے لئے صرف ایک شخص تیار تھا، اور وہ تھا رامو پٹواری۔ جس کی بھولی بھالی رادھا بچپن میں گوپال کے ساتھ راجہ رانی کا کھیل کھیلتی۔ مٹی کے گھروندے بناتی اور ڈھا دیتی۔ ان دونوں کو کھیلتے دیکھ کر رامو مُسکراتا ہوا چودھری صاحب سے کہا کرتا۔ "کتنی بھلی لگتی ہے ان کی جوڑی.......؟" اور چودھری جی ہولے سے سر ہلا کر مُسکرا دیتے .... رادھا بے چاری بچی، اسے کیا معلوم کہ اس کو ایک ایسے گلچیں کے حوالے کیا جا رہا ہے جس کی جوانی روٹھ چکی تھی۔

چنانچہ بات پکی ہو گئی کیونکہ سونے چاندی کی چمک نے رامو کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا....... اور پھر شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ سگائی میں رادھا کو سُندر سُندر گہنے چڑھے۔ بھولی بھالی رادھا بھی خوشی سے پھول گئی زیوروں کو دیکھ کر۔

چودھری صاحب کی شادی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جب گوپال کو پتہ چلا تو غریب کا دل تڑپ کر رہ گیا۔ ایک ننھی مُنی سی معصوم کلی، جسے وہ اپنی زندگی کے چمن میں کھِلانے کا خواب دیکھ رہا تھا، آج ایک ظالم گلچیں کے حوالے کی جارہی تھی۔ اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ قسمت اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔

مقررہ تاریخ سے پہلے گوپال رامو کے گھر گیا۔ رامو اپنے چبوترے پر بیٹھا حقّہ گُڑگُڑا رہا تھا۔ گوپال کو دیکھ کر ماتھے میں بل ڈال کر منہ بناتے ہوئے بولا۔ ....."کیوں صاحبزادے، کیسے چکر لگا اِدھر کا.........؟" گوپال نے اپنے دِل کا سب غبار نکال دیا۔ رامو کی تیوری ساتویں آسمان پر چڑھ گئی۔ ناک سکوڑتے ہوئے عجیب سا منہ بنا کر کڑکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "بھلا تمہارے

پاس دھرا ہی کیا ہے ؟ باپ کے روپے پر دان ویرکرن بننے کے خواب دیکھ رہے ہو ۔ ایک کوڑی نہیں دے گا چودھری تمہیں ۔ کس بل بوتے پر بیاہ میں بادھا ڈالنے آئے ہو ۔ ؟"

گوپال نے نہایت سنجیدگی سے کہا ۔ "رامو دادا ! کیا وہ دن اتنی جلدی بھول گئے جب مجھے رادھا کے ساتھ اکھٹے کھیلنے کے لئے، تم ہی گھر سے چوپال لے جایا کرتے تھے ۔ رامو دادا ، ذرا میرے دل سے تو پوچھو کہ رادھا کے لئے کیا کچھ کرنے کے لئے تیار ہے ......" مگر پتھر کی چٹان پر دریا کی لہریں آئیں اور کلکاریاں مار کر لوٹ گئیں ۔ رامو پر ذرا اثر نہ ہوا ۔ بلکہ اور زیادہ تمتما اٹھا ، اور کھردرے لہجے میں بولا ۔ "رادھا کو دل کی دھڑکنیں نہیں چاہئیں گوپال ، چاندی کی جھنکار کی ضرورت ہے ۔"

گوپال دھتکارے ہوئے کتے کی طرح واپس چلا گیا ۔ کتنی امیدیں لے کر آیا تھا، مگر کیا معلوم تھا کہ بے چارے کی سب امیدیں دھواں بن جائیں گی ...... اور پھر ایک روز دیکھتے دیکھتے رادھا گوپال کی سوتیلی ماں بن گئی ۔

گوپال کا دل کچھ ٹوٹ سا گیا ۔ پارٹی کا کام بھی اچھی طرح سے نہ ہوتا تھا ۔ اس کا کسی کام میں بھی جی نہ لگتا تھا .... اور پھر ایک دن چودھری صاحب کے ساتھ کسی بات پر من مٹاؤ ہو گیا ۔ یہ بات بڑھتی دیکھ کر اس نے گھر آنا جانا بند کر دیا ۔

اور پھر ایک روز مادھو پور کو بھی خیرباد کہنا پڑا ۔ مادھو پور کی جن گلیوں میں گوپال کی جوانی نے پرورش پائی تھی وہی گلیاں اس کو کاٹ کھانے کو آتی تھیں ۔ حسرت بھری نگاہوں سے ایک بار اپنی جنم بھومی کو دیکھا اور پھر ڈال سے ٹوٹے ہوئے اس سوکھے پتے کی مانند جسے تیز ہوا کے جھونکے گھسیٹ کر کہیں لے جاتے ہیں ، اور ایک انجانی جگہ پر چھوڑ دیتے ہیں ، وہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا ..... کہاں .... ؟ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا ۔

وہ رات بہت اندھیری اور بھیانک تھی ۔ گوپال کے چلے جانے پر آسمان بھی

رو رہا تھا۔ برسات کی وجہ سے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ پانی جو زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ آج تباہی کرنے پر آمادہ تھا۔ جمنا باندھ ٹوٹ جانے کی وجہ سے خطرناک سیلاب آگیا تھا۔ ان گنت گاؤں اُجڑ گئے ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے کتنے ہی لوگوں کی جانیں تلف ہوگئیں اور سب فصلیں تباہ ہوگئیں۔ ہر طرف تباہی اپنے دانت کٹکٹا رہی تھی۔ رادھا سارا زیور و نقدی لے کر چودھری کے نوکر کے ساتھ بھاگ گئی اور چودھری صاحب کا بقایا سامان تباہ و برباد ہوگیا۔۔!!

کالے کالے بادل ابھی تک جمے ہوئے تھے۔ ہاں البتہ اُن کا دم ضرور ٹوٹ چکا تھا اور ہوا ابھی سہج سہج بہہ رہی تھی۔ کچھ لوگ نیل دھارا ندی پر بنے ہوئے پُل کے دوسرے سرے پر جمع ہو رہے تھے۔ وہاں پر ایک درخت پتھر کی آڑ میں آکر اٹک گیا۔ اس کی شاخیں پانی کی سطح سے اوپر تھیں اور اُن میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کی گردن پھنسی ہوئی تھی۔ اس کا جسم برف کی مانند ٹھنڈا اور بے جان تھا۔

ـــ "شاید بے چارہ دم توڑ چکا ہے"۔ ایک نے کہا۔ اُسے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا تھوڑی دیر کی دوڑ دھوپ سے بوڑھے کی جان بچ ہی گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ کہاں سے درخت کے سہارے بہتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کو بچنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ نہ معلوم بھاگیہ نے کیا کیا رنگ دکھانے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔!

لوگوں نے اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کی، اور شہر کی شمشان بھومی میں چوکیداری کے لئے رکھ لیا۔ اور وہیں مندر کی ایک کوٹھری میں اس کے رہنے کے لئے انتظام کر دیا۔

قسمت کا ستارہ جب بلندی پر ہوتا ہے تو مٹی سے بھی سونا ملتا ہے۔ اور جب قسمت کا ستارہ ڈوبنے لگتا ہے تو بھنے ہوئے تیتر بھی اُڑ جاتے ہیں۔۔۔ گوپال کو نوکری کے لئے دربدر کی خاک چھاننی پڑی اور تانگوں کے پیچھے بھاگنا پڑا۔ مگر دُنیا والوں نے اُس کو نہ صرف دھکے دیئے بلکہ بھوکوں مرنے پر مجبور کر دیا۔ وقت کے تھپیڑوں نے اُسے پائمال کر دیا۔۔۔۔۔ یکایک ایک دن وہ سخت بیمار ہوگیا جسم

بالکل لاغر سا ہو گیا ...... اور پھر اچانک ہی شہر کے کسی تنگ سے کونے میں اس کی جوانی بکھر گئی۔ نازوں سے پالا ہوا خوبصورت جسم آج ایک کوچے کے گندے کونے میں پڑا تھا۔ اس کی مٹی ٹھکانے لگانے کے لیے چندے اکھٹے کیے گئے .... قدرت بھی اس کی موت پر آنسو بہا رہی تھی، اور ہوا سسک رہی تھی۔ مگر بے رحم بڈھا لکڑی کی دگنی قیمت مانگ رہا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ دگنی قیمت پر لکڑیاں دے کر وہ اپنے آپ کے ساتھ آخری ظلم کر رہا ہے۔ کتنا دردناک انجام اور کیسا انوکھا ملاپ تھا یہ۔ لاش کا چہرہ دیکھ کر وہ تڑپ کر گر پڑا۔ باپ نے بیٹے پر آخری بار فدا ہو کر اپنی تمام زیادتیوں اور سنگدلیوں کی قیمت چکا دی۔

دونوں کو ایک ہی چتا میں جلا دیا گیا۔ دہکتی چتا سے چھوٹی چھوٹی چنگاریاں ہوا میں لہراتی تاریکی میں سرخ لکیریں کھینچ رہی تھیں۔ دنیا والے نیند کی گود میں جا چکے تھے۔ اور ہوا دور جنگل میں ٹہنیوں سے لپٹ کر رو رہی تھی ......!!

●●

...اور وہ روتی رہی

سنہرا تاج پہنے آفتاب بے خبر دنیا والوں کو جھانک رہا تھا۔ چاروں طرف
ہریاول ہی ہریاول نظر آتی تھی۔ کوئل آموں کے درخت پر بیٹھی میٹھے گیت گا رہی
تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب پرندوں کو خوشی کا پیغام دے رہی ہے
نئے نئے پتے اور نئی نئی کلیاں خوشی کے مارے جھوم رہی تھیں۔ سامنے باغ
میں ایک فوارہ چل رہا تھا جو کہ بہت ہی بھلا لگ رہا تھا مگر ......پرندوں کا
چہچہانا، پھولوں کی سندرتا اور ٹھنڈی ہوا آشا کو خوش نہ کر سکی۔
آشا اپنی کوٹھی کی چھت پر بیٹھی قدرت کے اس دلکش منظر کو دیکھ ضرور رہی
تھی مگر اس کا دل کہیں اور ہی تھا وہ خیالات کی دوسری دنیا میں بھٹک
رہی تھی۔ وہ آج بہت اُداس تھی اس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا
پڑھنے بیٹھتی تو پڑھا نہ جاتا۔ سلائی کا کام کرنے لگتی تو وہ بھی اس سے نہ ہوتا...
بہت ہی بے چین نظر آتی تھی چپ چاپ جا کر صوفہ پر بیٹھ گئی.......اس کے
دماغ میں رہ رہ کر خیالات کی لہر اُٹھتی ......کیا زندگی ہے ہم لوگوں کی غلیظ
کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر۔ لاکھ مخمل پہنیں، میوے مٹھائیاں کھائیں، لیکن ایک
معمولی مزدورنی بھی ہمیں اپنے سے گئی گذری سمجھتی ہے۔ اور کیوں نہ سمجھے۔ وہ مزدوری
کرتی ہے۔ اپنی محنت بیچتی ہے۔ محنت ہاتھ کا میل ہے اور کوٹھے والیاں فروخت
کرتی ہیں جسم، عزت، پاکیزگی۔ مگر زندگی کی دھندلی شام جب ان ناچنے والیوں کے
تھکے ماندے جسموں پر جھریاں بن کر اُبھرنے لگتی ہے تب اُن کے خریداروں
میں سے کوئی جھانکنے بھی نہیں آتا.......کاش! میں ایک بازاری عورت

کی لڑکی نہ ہوتی...... اور اگر قدرت کو یہی منظور تھا تو مجھے اتنا خوبصورت کیوں بنایا.......؟ کالج میں مجھے سب لڑکیاں یہی کہتی ہیں — "آشا تم سچ مچ گلاب کی پنکھڑیوں جیسی خوبصورت اور نازک ہو. تم اتنی شرمیلی ہو کہ تمہاری یہ شرم تمہاری ان جادو بھری آنکھوں اور گلابی چہرے کی سندرتا کو چار چاند لگاتی ہے........ تم کتنی خوش قسمت ہو....... بھگوان تم جیسا سب کو بنائے...... مگر ان کو کیا معلوم کہ میرے جیسا اس دنیا میں کوئی بھی دکھی نہیں ہے. ماں ہے کہ مجھے نوکری کرنے نہیں دیتی. چاہتی ہے کہ میں بھی جوانی کی دکان سجاؤں. وہ تو یہی گناہ کا پیشہ کرانے پر خوش ہے. جو فخر ایک پاکدامن مزدورنی کو حاصل ہوتا ہے وہ ہم ایسی عورتوں کو بھلا کہاں نصیب، خواہ ہم بہت امیر ہی کیوں نہ ہوں..... اور اگر مجھے نوکری کرنے بھی دے گی، تو مجھے طوائف کی لڑکی جان کر کون اپنے اسکول یا کالج میں جگہ دے گا......؟ اپنی زندگی کی بیس منزلیں طے کر چکی ہوں مگر پھر بھی آزاد نہیں ہوں، جو کچھ میں کرنا چاہتی ہوں ماں کرنے ہی نہیں دیتی. وہ تو ہر وقت مجھے اس موئی دولت کا ہی طعنہ دیتی رہتی ہے. اگر میرا دل منچلے جوانوں سے بولنے کو نہیں چاہتا، تو مجھے مجبور کیوں کرتی ہے.......؟ میں تو ہر شخص سے جھوٹی محبت کا کھیل کھیلنا نہیں چاہتی کل ہی مجھے سیٹھ جمنا داس کے لڑکے کو گانا سنانے کی وجہ سے کتنی پھٹکار سننی پڑی تھی...... ہے بھگوان! اب تو یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا.

وہ انہی خیالات میں غرق تھی کہ اس کی ماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا — "آشا! بیٹی. تم کیا سوچ رہی ہو. ابھی تک تم نہائی بھی نہیں کیا......؟ چائے وائے بھی پیوگی یا نہیں —؟"

"ماں، آج میری طبیعت ٹھیک نہیں. سر میں چکر آ رہا ہے اور جی متلا رہا ہے. تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہوں."

"اچھا بیٹا تھوڑی دیر آرام کرو. اس کے بعد نہا دھو کر کچھ کھا پی لینا

آج مجھے کلکٹر صاحب کے یہاں ناچ پر جانا ہے۔ ان کے لڑکے کی سالگرہ ہے۔ تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا..... چلوگی نا ــــ؟

آشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں تھوڑی دیر خاموش کھڑی رہ کر چلی گئی ماں کے چلے جانے کے بعد وہ پھر چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے نہ غسل کیا، اور نہ ناشتہ۔ تمام وقت اپنا مستقبل سوچنے میں گذار دیا...... رہ رہ کر وہ سرد آہیں بھرتی رہی۔ اس کو وقت کا ذرا بھی خیال نہ رہا۔ دیوار پر لٹکے ہوتے کلاک پر جب نظر ڈالی تبھی چار کھڑک گئے۔

"کمبخت نے ڈٹ کر شرط لگا رکھی ہے..." کلاک کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے شکستہ آواز میں کہا...... وہ کچھ گھبراسی گئی۔ اس کی ماں اس کے کمرے میں پھر آئی ــــ "آشا! کیا بات ہے جو اسطرح بجھی بجھی سی بیٹھی ہو۔ کیا آج میرے ساتھ نہیں جاؤ گی ــ؟"

"نہیں ماں....... میں نہیں جا سکوں گی۔ میری طبعت نہیں ٹھیک ــــ

"آشا! بھلا کیوں اتنے بہانے بناتی ہو۔ طبعیت کی خرابی فقط اِک بہانا ہے تمہارا۔ تمہیں معلوم جو تھا کہ کلکٹر کے گھر جانا ہے اس لئے صبح ہی سے چونچلے کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔ پڑھایا لکھایا........ اس لئے کہ تم مجھے دکھ دو...... نہیں بلکہ اس لئے کہ جب میرے جوبن کی کلی مرجھا جاتے تو تم میری مدد کرو۔ بڑے بڑے سیٹھ اور رئیس آتے ہیں اور تمہارے قدم چومتے ہیں۔ لیکن تم ہو کہ اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں، وہ بے چارے اپنا سا منہ لے کر نااُمید ہو کر لوٹ جاتے ہیں ــــ........ تم کو اتنا غرور آخر کس بات کا ہے........؟" ...... ذرا خاموش رہ کر پھر کہنے لگی......" آشا! تم اب بچی تو ہو نہیں۔ سب کچھ اچھی طرح سے سمجھتی ہو۔ ہمارا کوئی خاندان تو ہے نہیں، جو کوئی شریف گھر کا آدمی تجھے بیاہ کر لے جائیگا یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم اپنے پیشے سے نفرت کرتی ہو........؟ آخر

تمہیں کرنا وہی پڑے گا جو ہمارا پیشہ ہے۔۔۔۔۔۔ آج تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا ہوگا۔" ماں نے ایک ہی سانس میں سب باتیں کہہ دیں۔ اور بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔۔۔۔ آشا کو اپنی ماں سے ایسے طعنہ آمیز الفاظ کی توقع نہ تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔۔ بار بار اس کے کانوں میں یہی الفاظ گونج رہے تھے۔۔۔۔۔۔ "تو کوئی اچھے خاندان کی تھوڑے ہی ہے، جو تجھے کوئی شریف لڑکا بیاہ کر لے جائے گا۔۔۔۔۔۔۔" یکایک وہ کانپ اُٹھی اور بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگی۔۔۔۔۔۔۔ "ہے پربھو! کاش میں بازاری عورت کی لڑکی نہ ہوتی۔۔۔۔۔۔۔ کیا مجھے کوئی اپنے دل میں جگہ دے سکے گا۔۔۔۔۔۔؟ یہ سوچتے سوچتے اور روتے روتے وہ سو گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو شام کے سات بج چکے تھے۔ اس کی ماں تیار ہو کر اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی اور بڑے پریم سے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ آشا کو جاگتے دیکھ کر وہ بڑی میٹھی اور پیار بھری آواز میں بولی ـــــ "آشو، بیٹا! ناراض نہ ہو جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سب تیرے ہی بھلے کے لئے کہا ہے۔ یہ باتیں اگر آج نہیں تو کل ضرور تجھے ماننی پڑیں گی۔۔۔۔۔۔ چلو اٹھو، تیار ہو جاؤ دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔!"

"لیکن ماں! وہاں میں ناچ نہ سکوں گی۔"

"اچھا نہ ناچنا۔ رونق تو دیکھ آنا۔۔۔۔۔۔!"

اس کے بعد آشا نے دھانی رنگ کی ایک خوبصورت ساڑھی زیب تن کی اور ماں کے ساتھ کلکٹر کے گھر چل دی۔ کلکٹر صاحب کی کوٹھی پر روشنی کا خوب جوبن آرہا تھا۔ سرخ، سبز، اُودے اور ہرے رنگ کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ کوٹھی کی سجاوٹ اور چمک دمک دیکھ کر آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں بڑی دھوم دھام تھی۔ بہت سے لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ یکایک اتنے آدمیوں کو دیکھ کر آشا گھبرا سی گئی۔ جیسے کوئی لیکچرار پہلی بار پبلک سٹیج پر آیا ہو۔ دونوں ماں بیٹی کو سجے ہوئے کمرے میں بٹھایا گیا۔

وقت مقررہ پر ناچ شروع ہوا۔ سب لوگ ناچ کو بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے، مگر آشا کی آنکھیں انگارے اُگل رہی تھیں آشا کی ماں کے آگے روپیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ وہ اپنی اس کامیابی پر پھولی نہیں سمارہی تھی اور سب کے اشاروں کا جواب مسکراہٹ کے ساتھ دے رہی تھی۔ کلکٹر نے اس سے آشا کو ناچنے کے لئے کہا۔ مگر ماں نے...... "آج اس کی طبعیت ٹھیک نہیں۔" کہہ کر ٹال دیا۔ آشا سر ڈھک کر نیچی نظریں کئے بیٹھی رہی..... بجلی کی روشنی میں وہ دیوی کی مورتی نظر آرہی تھی سب مردوں اور عورتوں کی نظریں ان دونوں ماں بیٹیوں پر ہی جمی تھیں سبھی یہ کہہ رہے تھے، کہ ماں تو بالکل بازاری عورت ہی لگتی ہے...... لیکن لڑکی ایک بھلے گھر کی سوشیل کنیا معلوم ہوتی ہے...... آشا خاموش بیٹھی تھی۔ دفعتاً اس کے کانوں میں یہ آواز آئی

...... "راجن بیٹا۔ ذرا جاکر پان الائچی تو لے آؤ۔"

"اچھا جی —!"

آشا نے اُدھر دیکھا تو ایک شرمیلے خوبصورت جوان پر نظریں جاگڑیں۔ وہ نوجوان بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوگئیں۔ آشا نے جھٹ آنکھیں جھکالیں۔ مگر آنکھیں خود بخود پھر اُٹھیں اور پھر نیچے ہوگئیں۔ خاموش نگاہوں نے جو کچھ کہنا سننا تھا، کہہ سن لیا، اور پھر وہ نوجوان اندر چلا گیا۔ یہی وہ راجن تھا......! آشا کا دل کچھ ڈھونڈ رہا تھا کہ اتنے میں آشا نے سُنا...... ایک عورت دوسری عورت سے پوچھ رہی تھی......

"اری بہن! یہ راجن کون ہے......؟"

"اس خوش مزاج نوجوان کو کون نہیں جانتا......؟"

"بھلا اس کی شادی ہوگئی ہے یا نہیں......؟ بڑا بھولا بھالا ہے......!"

"نہیں ابھی کہاں۔ راجن ابھی شادی کرنا پسند ہی نہیں کرتا...!"

"کتنے بھائی بہن ہیں یہ —؟"

"اجی۔ بھائی بہن کیا۔ راجن تو ڈپٹی صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ہونہار ہونے کی وجہ سے ۲۸ سال کی عمر میں ہی مجسٹریٹ بن گیا۔ ایک سال شہر میں پلیگ پھیلی اور راجن کے ماتا پتا اس کے شکار ہو گئے۔ اس دنیا میں اکیلا ہونے کی وجہ سے وہ اُداس سا رہتا ہے مگر شیر کا بچہ بھی شیر ہی ہوتا ہے۔ اس نے اتنی مصیبتوں کا سامنا بہادری سے کیا اور ہمت نہ ہاری۔ کلکٹر صاحب راجن کے پتا کے گہرے دوست ہیں۔ مرتے وقت وہ راجن کا ہاتھ کلکٹر صاحب کے ہاتھ میں پکڑا گئے تھے۔ کلکٹر صاحب راجن کی خوبیوں پر بہت خوش ہیں اور اس سے بہت پریم کرتے ہیں۔ ان کے گھر میں راجن کے سوائے اور کوئی بچہ نہیں ہے اس لئے گھر کی باگ ڈور راجن کے ہی ہاتھ میں ہے جو کوئی کام بھی کلکٹر صاحب کرتے ہیں۔ راجن کی رائے کے بغیر نہیں کرتے۔ راجن بھی انھیں پتا کے سمان سمجھتا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے۔ وہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ اس نے راجن کو آتے دیکھا۔ کلکٹر صاحب نے راجن کو ہی پان الائچی بانٹنے کو کہا۔ راجن جب پان بانٹتا ہوا آشا کے پاس پہنچا تو کچھ ٹھٹھک سا گیا جیسے سامنے کالا ناگ ہو دونوں کی آنکھیں ملیں اور خود بخود جھک گئیں۔ جب راجن طشتری کی طرف دیکھتے ہوئے پان دینے لگا تو یکایک دونوں کی انگلیاں آپس میں چھو گئیں۔ راجن پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اور طشتری گرتے گرتے بچی۔ آشا کا چہرہ قمقمے کی مانند سرخ ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بھوکی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ دونوں خاموش تھے مگر پھر بھی دل کی دھڑکنوں نے ایک دوسرے کے دل کا بھید کھول دیا۔

یہ دو دلوں کا ملاپ اور تو کسی نے نہ دیکھا، صرف آشا کی ماں اور کلکٹر صاحب ضرور دیکھ رہے تھے۔ آشا کی ماں کے چہرے پر خوشی کی لہر تھی اور کلکٹر صاحب کے چہرے پر غصہ...... دونوں ماں بیٹی نے کلکٹر صاحب کے گھر پر ہی کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت بھی آشا کی آنکھیں راجن کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

اس کی آنکھوں سے ایک خاص قسم کی محبت کی کرن نکل رہی تھی کبھی کبھی راجن بھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ پارٹی ختم ہونے پر رات کے بارہ بجے دونوں گھر واپس آگئیں ....!! اس رات آشا کو نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدل بدل کر رات گذاری۔ اس کے دل میں بار بار یہی سوال اٹھتا تھا.... کیا راجن مجھ سے محبت کر سکے گا۔ ؟ کبھی اس کے دل سے آواز آتی .... ضرور کریگا........ اور کبھی آتی ـــــ ہرگز نہیں۔" لیکن پھر بھی آشا سوچتی کہ رات کو راجن کی آنکھیں سب کچھ بتا رہی تھیں، اور پھر خود بخود ہنسنے لگتی........
.....اور کہتی ـــــ ارے پاپی من، تیری ایسی قسمت کہاں ....؟ کیا کبھی آسمان سے تارے اتارے جا سکتے ہیں......؟ راجن ایک اعلیٰ خاندان کا لڑکا ہے اور میں ایک.........!! یہ بات سوچ کر وہ چلے اُٹھتی۔ اس کا جسم پھولوں کی بیل کی مانند کانپ اُٹھتا۔ یہی باتیں سوچتے سوچتے اس کو چار بجے کے قریب نیند آگئی۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ راجن کہہ رہا تھا........ آشا گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں سماج کے بندھنوں کو توڑ کر اپناؤں گا.......!" جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج کی کرنیں کھڑکی کے راستے اندر آکر اس کے گالوں کو چوم رہی تھیں........ گذری باتیں رہ رہ کر اس کے دل میں آنے لگیں۔ سوچ سوچ کر وہ اتنی بے چین ہوگئی کہ اس کا غم آنسوؤں میں بدلنے لگا۔ لیکن اس کی یہ قابلِ رحم حالت دیکھنے والا کون تھا........ سوچتی، نہ جانے راجن مجھے چاہتا بھی ہے یا نہیں....
پھر یکایک سپنے والی بات سوچ کر بڑبڑانے لگی.......

جو سُکھ تقدیر میں نہیں ہوتے دُکھ بن جاتے ہیں۔

اُدھر راجن کا یہی حال تھا۔ برابر کی آگ لگی تھی۔ وہ سوچتا...... وہ دیوی کون تھی........؟ کاش! میں اس کو مل سکتا۔ دن رات وہ اُداس رہنے لگا۔ پہلے وہ خوش مزاج تھا۔ لیکن اب غمگین نظر آتا۔ اس کا دل بھی کسی

کام میں نہ لگتا .... وہ کچہری جاتا اور گھر واپس آنے پر تمام وقت گھر کی
چار دیواری میں ہی گذار دیتا۔ وہ ہر وقت آشا کی یاد میں بے چین رہنے لگا
جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا، چہرہ پیلا پڑ گیا اور
آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئیں اور .... یہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔
ڈاکٹروں نے ٹی۔ بی بتائی اور کسی صحت افزا مقام پر جانے کی نصیحت کی ... مرتا
کیا نہ کرتا راجن کو مجبوراً اپنے شہر سے دور گھر سے دور اور ...... اپنی محبوبہ
سے دور جانا پڑا۔ مگر آشا کی یاد کو ہزار کوششیں کرنے پر بھی دل کی جھولی سے
باہر نہ نکال سکا۔

آشا نے جب یہ سب سنا وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ راجن
کس پہاڑ پر گیا ہے ... ؟ آشا کی ماں اس کے دل کی تڑپ نہ جان سکی۔ جب
وہ پوچھتی تو آشا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ آشا اپنے دیوتا
کے لئے تڑپ تڑپ کر رہ جاتی۔

وقت گذرتا گیا۔ آشا کی ماں دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے
اس دنیا سے چل بسی۔ آشا اپنی تمام جائداد ایک وفادار نوکر کے سپرد کر کے
راجن کو ڈھونڈنے نکل پڑی۔

گاڑی شملہ کی سرسبز پہاڑیوں کے سینے کو چیرتی جا رہی تھی۔ آشا کو ایسا
معلوم ہوا جیسے موت کے فرشتے اس کو بالوں سے پکڑے نوکیلے پتھروں، تیز
کانٹوں اور تپتی ہوئی ریت میں سے گھسیٹتے لئے جا رہے ہیں ...... اور پھر
یکایک ایسا لگا کہ اس کو بجائے یمراج کے روبرو پیش کرنے کے ایک انجانی
جگہ چھوڑ گئے۔

وہ بے چاری صبح و شام۔ دن رات اپنے راجن کو ڈھونڈتی اس انجانے علاقے میں،
مگر راجن اُسے کہیں دکھائی نہ دیتا ...... شاید کسی دوسرے پہاڑی کے
مقام پر نہ چلا گیا ہو .... مگر آخر کون سا مقام ؟

وہ اس کا آخری دن تھا اس شہر میں۔ سورج دن بھر کا سفر طے کر چکا تھا اور اپنی منزل کے قریب پہنچ رہا تھا۔ مگر آشا اپنے راستے سے پرے ہی بھٹک رہی تھی .... وہ ایک اونچے پہاڑ پر چڑھ گئی۔ اور ایک چشمے کے قریب گھاس پر بیٹھ گئی.......... ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کو جھلستی ہوئی لُو کے برابر محسوس ہو رہی تھی۔ قدرت کے دلکش منظر کو دیکھ کر اس کا زخمی دل اور بھی رو اُٹھا۔ وہ بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگی......"ہے بھگوان! مجھے ایک بار میرے پریتم کے درشن کرا دو۔"

سورج اپنی آرام کرنے کی سیج پر جا چکا تھا۔ رات کی دیوی نے اپنے بال بکھرانے شروع کر دیے......۔ آشا آتے جاتے آدمیوں کو بغور دیکھ رہی تھی........ یکا یک ایک دُبلا پتلا شخص اس کے سامنے سے گذرا۔ آشا بھاگ کر اس کے قدموں پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر.......... رونے لگی اس شخص نے بھی آشا کو پہچان لیا تھا اور اسے اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر اپنے پاس بٹھایا...... آشا کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے اس شخص کی آنکھیں بھی آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب گئیں۔ اگرچہ دونوں خاموش تھے مگر اُن کے آنسو ایک دوسرے کے دل کا حال بتانے لگے .... اب راجن اور آشا تمام دن اکٹھے ہی رہتے۔ آشا سچے دل سے راجن کی سیوا کرتی اور پانی کی طرح اپنا دھن لٹاتی۔ لیکن نہ جانے راجن نے کیسی سوئی نگل لی تھی کہ سوکھ کر کانٹا ہوتا چلا گیا.......!

راجن کی یہ حالت دیکھ کر آشا بے چین ہو جاتی........ اُسے خود پر غصہ آتا اور قدرت پر بھی مگر........ انسان کر ہی کیا سکتا ہے؟

اُس روز راجن کی طبیعت کافی ٹھیک تھی۔ راجن نے کہا......... دیکھو آشا آج جلدی جلدی سارا کام کر لو۔ پھر تمہیں ایک ایسی جگہ لے چلوں گا جہاں ہم اور تم دونوں ہی ہونگے اور کوئی نہیں ہوگا۔ دریا کا کنارا ہوگا......اور

باقی پھر بتاؤں گا جاؤ پہلے جا کر دوا لے آؤ۔ آشا دم بھر میں واپس لوٹ آئی اور سرہانے کھڑے ہو کر مخمل جیسے نرم لفظوں سے پکارا ...... بو راجن اٹھو، دوا پی لو۔ اٹھو... راجن بتاؤ نا، دریا کا کنارہ ہو گا...... سے پیارا پیارا ہو گا اور...... ؟ بولو بھی راجن...... جب تین چار مرتبہ پکارنے پر راجن نے کوئی جواب نہ دیا تو آشا گھبرا سی گئی۔ اس نے پلک دیکھی تو بند۔ نبض غائب۔ روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی...... بس پھر کیا تھا۔ اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر راجن کی چارپائی پر گر پڑی۔ بے ہوشی کے عالم میں اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی کہہ رہا ہے...... تمہیں آخر وہی کرنا پڑے گا جو ہمارا ایشور ہے آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ آخر تمہیں یہ سب باتیں ضرور ماننی پڑیں گی ...... !! خوف ناک ہوا چل رہی تھی۔ شام کے گہرے سائے اُفق کی پیشانی سے پر منڈلا رہے تھے۔ مغرب میں دن کی چتا جل کر سرد ہو چکی تھی مگر...... مرگھٹ میں ایک چتا ابھی دہک رہی تھی...... چتا سے ہلکی ہلکی نیلی شعاعیں فضا میں مچل رہی تھیں، سرخ چنگاریاں تاریکی میں لکیر کھینچتی لہرا جاتیں...... آسمان میں سانولی گھٹائیں جھوم رہی تھیں۔ دور کسی کے گانے کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر آ رہی تھی

او چھوڑ کے جانے والے

دل توڑ کے جانے والے

کیوں تو نے مجھ کو رُلایا

چتا سے دھیمی دھیمی آنچ اُبھر رہی تھی۔ سب لوگ مرگھٹ سے جا چکے تھے مگر......

ایک عورت پتھر پر گم سم بیٹھی روتی رہی...... !

جلتا ہوا شہر

آسمان میں بادل اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی غریب نے اپنے پھٹے پُرانے چیتھڑے پانی میں سے نکال کر سُکھانے کے لیے اِدھر اُدھر پھیلا دیے ہوں ہوا تھک کر دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ہلکی پھوار شروع ہو جاتی بھٹنڈا بس اسٹینڈ پر مسافر اپنی اپنی بسوں کے لیے بھاگ دَوڑ میں مصروف تھے۔ یکایک سری گنگانگر سے چل کر انبالہ جانے والی بس بھی آپہنچی۔ بس رُکتے ہی مُسافر اس پر ٹوٹ پڑے۔ کیونکہ اس طرف جانے والی یہ آخری بس تھی اور سبھی لوگ اپنے اپنے مقام پر رات ہونے سے پیشتر ہی پہنچنے کے لیے بے تاب تھے۔ اور پھر کون جانے کہاں اور کِس وقت کرفیو لگ جائے یا ہائی جیکنگ کا کوئی خطرناک حادثہ ہو جائے

اسی بس کے نزدیک شیطانی صورت والے دو چار نوجوان آپس میں گندی اشارہ بازی کرتے ہوئے ہلڑ مچا رہے تھے۔ شاید اُس نوجوان حسینہ کو دیکھ کر جو ہاتھ میں چھوٹا سا بریف کیس تھامے اور کندھے پر پرس لٹکائے اسی بس میں چڑھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ داخل ہونے والے دروازے میں شرارتی لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ آخر تو تُو تڑاک کے بعد راستہ صاف ہو گیا اور لوگ باگ اپنی اپنی سیٹ پر قبضہ کرنے کے لیے اِدھر اُدھر لُڑھکنے لگے۔ اس افراتفری کے عالم میں کئی لوگوں نے اپنی سیٹ تک پہنچتے پہنچتے میرے پَیروں کا بھرتہ بنا دیا تھا۔ کسی کو اگر کچھ کہا تو اس نے جھٹ سوری (SORRY) کہہ دیا۔ ان بھلے لوگوں کو کوئی کیسے سمجھائے کہ کسی کے مُنہ پر تھپڑ مار دینے کے بعد معافی مانگ لینے سے تھپّڑ کا

اثر تو زائل نہیں ہو جاتا۔

اِسی اثنا میں دو تین شرارتی منچلے دھکم دھکا کرتے ہوئے اندر گھس آئے تھے۔ اَور اُس نازنین کی سیٹ کے ساتھ چپک کر کھڑے ہوگئے اَور اوٹ پٹانگ بولنا شروع کر دیا۔ وہ بے چاری سہمی سہمی، سُکڑی سُکڑی سیٹ کے اندر دھنسی جارہی تھی۔ اس کی بغل میں بیٹھا ہوا ایک سفید پوش یہ نوٹنکی دیکھ رہا تھا۔ میں ذرا پرے ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا اور یہی سوچ رہا تھا کہ وہ شریف بزرگ ہی شاید کوئی ایسا پتہ پھینکے گا جس سے یہ بیہودہ چھیڑ خانی ختم ہو جائے۔ اگرچہ وہ بزرگ ان شرارتی چھوکروں کی طرف گھور تو ضرور رہا تھا۔ لیکن اس کے لب جیسے کسی نے سی دیے تھے۔ بس میں بہت سی اوچھی نگاہیں اس شریف زادی پر مرکوز تھیں...... یہ وہ کونسی نظر ہے جو بد نہیں ہوتی۔

وہ بھرے بھرے بدن والی قبول صورت لڑکی تھی۔ ہلکے بادامی رنگ کی ساڑی اور کالے سلیولیس بلاؤز میں اس کے جسمانی نشیب و فراز منچلوں کو بار بار اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ بات چیت کے سلیقے سے وہ کسی شریف گھرانے کی بہو بیٹی لگتی تھی۔

بس کی روانگی کا وقت ہو چکا تھا اور کنڈکٹر صاحب لاپتہ تھے۔ اُس کو بس مسافروں کے دُکھ تکلیف کی بھلا کیا فکر۔ لوگ باگ دھکے کھا کر اپنے مقام پر پہنچ ہی جائیں گے۔ بسیں اور ریل گاڑیاں اگر لیٹ چل رہی ہیں تو کیا ہوا، لوگ اپنے ٹھکانوں پر تو پہنچ ہی جاتے ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں......؟

سبھی اِدھر اُدھر کی ہانک رہے تھے کہ دفعتاً بس چل پڑی۔ کچھ لوگ بغیر سیٹ کے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک شرارتی نوجوان تین مسافروں والی سیٹ پر زبردستی گھس بیٹھ کر کے چپک گیا تھا...... وہ بے چاری اور بھی سُکڑ گئی۔ مسافروں کی شکایت پر کنڈکٹر اُس ضدی نوجوان کے پاس پہنچ کر غصے کے لہجے میں بولا، دہکتے جاتا ہے؟

"بادشاؤ! بھاویں جہنم نے چلو......!"

بس کے ایک کونے سے کھوکھلی ہنسی اُبھری اور ساتھ ہی آواز آئی ـــــ "ابھی جہنّم تک سڑک مکمّل نہیں ہوئی. پوری طرح تیار ہو جانے پر اُدگھاٹن تمہارے ہی ٹکٹ سے ہو گا" اور پھر چاروں طرف سہمی سہمی ہنسی کی بوچھاڑ شروع ہو گئی ـ اس نازنین کی بغل میں بیٹھا ہوا وہ کھوسٹ بھی ذرا کھسیانہ ہو کر ہی ہی کرنے لگا. اس پر لڑکی نے ایک بار اس کی طرف دیکھ کر منُھ دوسری طرف پھیر لیا. اس بوڑھے کے جسم میں جیسے برقی لہر دوڑ گئی ہو..... جھٹ اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے پُر معنی نظروں سے بغور اِدھر اُدھر دیکھا...... شاید اس کو کچھ گمان ہو گیا تھا....... یا عہدِ جوانی کی گزری ہوئی برساتوں کی یاد مچلنے لگی ہو. اگرچہ وہ زندگی کے بوجھ اور کفن تلے دبا ہوا ہانپ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر نمایاں تاثرات و حقیر حرکتیں کہہ رہی تھیں...... ؎

ابھی تو میں جوان ہوں

مَیں نے اُس شخص کو ایک دو مرتبہ گھور کر دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی. نتیجتاً اپنی جھینپ مٹانے کی غرض سے اس نے ملتجانہ لہجے میں مجھ سے میگزین مانگ لیا. اخلاقی طور پر میں نے دے تو دیا، لیکن دل ہی دل میں ان بیہودہ لوگوں کو کوسنے لگا جو سفر میں اخبار یا میگزین مانگ کر پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں......... اسی اثنا میں ان خرافاتی نوجوانوں میں سے ایک نے موقع پاکر اُس کی چُٹکی بھر لی. وہ بے چاری تلملا کر رہ گئی. بھلا کر بھی کیا کر سکتی تھی...... مجبور، بے کس اور کمزور......... اور آدمی کتنا خطرناک ہے کہ کمزور اور مجبور کو زیادہ سے زیادہ جُھکاتا چلا جاتا ہے. کمزور کی کمزوری اور مجبور کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے.....!

کچھ دیر کی دوڑ دھوپ کے بعد ہماری بس برنالہ بس اسٹینڈ پر پہنچ کر رُک گئی. وہ بوڑھا، چھیلا جو میگزین کی ورق گردانی میں محو تھا، ہڑبڑا کر میگزین بند کر کے یوں فرمانے لگا ـــ "سبھی قصّے کہانیوں میں عورت کا کردار نمایاں

ہوتا ہے۔ عورت ہی ایسا محور ہے جس کے چکر میں انسان ساری عمر اُلجھا رہتا ہے........!" دوران گفتگو وہ آنکھیں چرا کر حوا کی بیٹی کو گھونٹ گھونٹ کر پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میری کھنکار نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس کی بات کاٹ کر میں نے برجستہ کہا ــــ "بزرگوار! عورت ہی آدمی کی شکتی ہے اور سب سے بڑی کمزوری بھی۔ اور جب تک دنیا کے دانشور اور سائنس دان سب مل کر عورت سے زیادہ پُرکشش کوئی دوسری چیز ایجاد نہیں کرتے، تب تک عورت ہی شعر و شاعری کا موضوع اور رنگین محفلوں کا طلسمی گہنا بنی رہے گی اور سڑک پر گزرنے والے اسکوٹر اور سائیکل سوار قریب سے گزرنے والی ہر عورت کو اسی طرح بدستور مُڑ مُڑ کر دیکھتے رہیں گے، اور سڑکوں پر یونہی حادثے ہوتے رہیں گے۔"

ہماری گفتگو سُن کر اچانک اُس لڑکی نے میری طرف متلاشی نظروں سے دیکھا۔ اور پھر سلیقے سے اپنا آنچل درست کر کے معصومانہ انداز میں کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگی، مگر اُس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ بھلا وہ بولنے کی جرأت کرتی بھی کیسے...... من ہی من میں سلگنے والی کئی صورتیں اِدھر اُدھر موجود تھیں۔ دفعتاً ایک شدید جھٹکا لگا۔ بس رُکی اور کوئی اُتر گیا۔ دوسرے ہی لمحے بس دوبارہ سڑک پر رینگنے لگی۔ اُس لڑکی کے عین قریب بیٹھے ہوئے شرارتی لڑکوں نے اُس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ پھر شروع کر دی۔ کبھی اُس کا پاؤں دبا دیتے اور پھر اُس کی ساڑی کا پلّو دھیرے سے کھینچ لیتے۔ اور کسی موڑ پر جب ہچکولہ لگتا تو شرارتاً اُس کی طرف لُڑھک جاتے۔ غرضیکہ اُس بے چاری کا بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہ معصوم جان کسی شکاری کے گھیرے میں پھنسی ہوئی ہرنی کی طرح مایوس کُن نظروں سے آزادی کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھتی مگر تڑپ کر رہ جاتی۔ اسی اثنا میں بس سنگرور شہر کے بازار میں یکایک ٹھہر گئی اور میری بغل میں بیٹھا ہوا مسافر اُتر گیا۔ فوراً اس لڑکی نے مجھ سے مخاطب

ہو کر ملتجانہ لہجے میں کہا — "انکل! میں آپکے پاس خالی سیٹ پر بیٹھنا چاہتی ہوں۔ ذرا میری مدد کریں۔!!"

اُس کی بے بسی کی حالت اور دل کی آہ و پکار سے میرا دل تڑپ اُٹھا۔ دل و دماغ اور خیالات میں زبردست ڈینٹ (خم) پڑ گیا مجھے یوں لگا کہ جیسے اپنی ہی بچی معمولی سہارے کے لئے التجا کر رہی ہے۔ ضمیر نے جھنجھوڑتے ہوئے احساس دلایا کہ شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ ہر جگہ ہی ناجائز سلوک کیے اور ظلم و ستم ڈھائے جاتے ہیں۔

ویسے تو عورت پر ازل ہی سے ظلم ہو رہے ہیں۔ بھلا کیوں۔؟ معاً بس کے جھٹکے نے دل و دماغ میں ہو رہے فساد کو منتشر کر دیا۔ فوراً حوصلہ کر کے بلند آواز میں اُس لڑکی کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اُس نے پہلے ان انسانی صورت والے وحشیوں کی طرف گھور کر دیکھا۔ اور پھر سہمی ہوئی آواز میں آہستہ سے پوچھا — "آپ پٹیالہ جائیں گے نا —؟"

"ہاں، ہاں بٹیا! تم گھبراؤ مت۔" اس کو تسلی دیتے ہوئے مَیں نے دلیرانہ انداز میں جواب دیا اور پھر چند لمحے کی پُر سکون خاموشی کے بعد اُس نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا کہ ...... وہ کالج میں انگلش کی لیکچرار لگی ہوئی ہے۔ دو تین مہینے پہلے وہ اسی بس میں آ رہی تھی۔ بس میں گِنے چُنے مسافر تھے اور وہ سبھی خوف زدہ تھے۔ سہما سہما سا ماحول، ڈرا ڈرا سا وقت، زہریلی فضا، روتے ہوئے راستے، سُونی سُونی سڑک اور سڑک کے دونوں طرف تیز ہوا میں مچلتے ہوئے درخت .... کہتے کہتے اُس نے گھبرا کر جھرجھری سی لی۔ مگر فوراً خود پر قابو پاتے ہوئے اپنی آپ بیتی پھر سُنانی شروع کی ...... وہ درخت وہ جھاڑیاں دُور سے بھاگتے آتے ہوئے یوں لگے۔ جیسے خونخوار لوگ بندوقیں تانے بس کو گھیرنے کے لئے تیز رفتار سے بڑھے آ رہے ہوں ...... نہ معلوم کس وقت بس کو ہائی جیک کر لیں اور معصوم لوگوں کی ہتیا کر ڈالیں ...... بس میں مسافر چرچا کر رہے تھے کہ شہر میں دوبارہ کرفیو نہ لگ جائے

... آجکل قانون کہاں ہے بھیا...... اب تو بس من مانی ہے لاٹھی والا بھینس ہانک لے جاتا ہے........ اور پٹیالہ بس اسٹینڈ پر جب بس آکر رُکی تو سانجھ ڈھل چکی تھی۔ بس اسٹینڈ والی چہل پہل کہیں نہیں تھی۔ مجھے یوں لگا کہ سارا شہر کسی کے ماتم میں اُداس ہو۔ کسی کونے سے بھی چوں تک کی آواز نہیں آرہی تھی۔ بس سے جو تھوڑی بہت سواریاں اُتری تھیں وہ پلک جھپکتے ہی نہ جانے کہاں گم ہوگئیں۔ میں حیران ہوکر ایک آدھ منٹ اِدھر اُدھر دیکھتی رہی اور پھر بوجھل قدموں سے دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔ کہیں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ پوچھ تاچھ کریں بھی تو بھلا کس سے۔؟ کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ چاروں طرف مرگھٹی سناٹا۔ سارے شہر پر جیسے کوئی بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ آٹو رکشا تلاش کی۔ مگر سب ندارد۔ پہلے یہ رکشا اور آٹو والے سواریوں کے اُترتے ہی گھیراؤ کر لیتے تھے۔ لیکن اُس دن وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا البتہ سامنے کچھ فاصلے پر چند پولیس مین ایک ٹوٹی پھوٹی سی دکان پر بیٹھے اِدھر اُدھر کی ہانک رہے تھے اور ایک دو چائے کی چسکیاں لے رہے تھے دو چار بڑی سگریٹ کا دھواں اُگل رہے تھے اور دو ایک چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ مجھے سڑک کے کنارے کھڑا دیکھ کر ایک سپاہی نے اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے کہا اور زور سے للکارا ــــ ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس علاقے میں کرفیو لگا ہوا ہے۔ سڑک پر چلنا پھرنا سخت منع ہے۔ بڑے صاحب کا حکم ہے کہ دیکھتے ہی گولی مار دو۔''

''اُونہہ گولی مار دو .... ان دنگا فساد یا لوٹ مار کرنے والوں کو یا امن پسند شہریوں کو........؟'' اُس نے دلیرانہ انداز میں جواب دیا تھا۔

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ جیسے وہی سین دوبارہ آنکھوں کے سامنے آگیا ہو..... آنکھوں کو ملتے ہوئے اُس نے پھر کہنا شروع کیا ــــ ''اتنے میں ایک اسکوٹر والا بھائی میرے قریب پہنچ کر رُک گیا میں نے جھٹ اُسے پہچان لیا۔ وہ ہمارے پڑوس میں رہنے والی میری سہیلی کا بھائی ہی تھا۔ پولیس کے سپاہی نے اُسے

ٹوکا اور بڑھ کر پاس آگیا۔ اُس بھائی نے جھٹ کرفیو پاس نکال کر اُس کی طرف
بڑھا دیا۔ دیکھتے ہی پولیس والا کٹ سا گیا۔ لیکن پھر بھی اپنی دھونس جماتے
ہوئے وہ اکڑ کر بولا کہ فوراً یہاں سے چلے جائیں......چنانچہ وہ بھائی
مجھے اسکوٹر پر بٹھا کر جھٹ گلیوں کے راستے چل دیا۔ کیونکہ دوسری طرف شرارتی
لوگوں نے بازار میں کچھ دوکانوں کو آگ لگا دی تھی اور یہاں وہاں کئی جگہوں پر
پتھراؤ ہو رہا تھا۔

جب ہم گلیوں میں سے گزر رہے تھے تو یکایک ایک زبردست دھماکہ ہوا جیسے
آسمان پھٹ گیا ہو۔ دلیر بھائی نے فوراً بریک لگا کر اِدھر اُدھر کچھ دیکھا۔ لوگ
باگ اپنے گھروں کی چھتوں پر سہمے سہمے کھڑے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہے تھے۔
ابھی ایک تنگ گلی پار کرکے ہم اپنی گلی میں داخل ہونے ہی تھے کہ ایک دندناتی ہوئی
گولی نزدیک سے نکل گئی۔ بھگوان کی کرپا سے ہمارا تو بچاؤ ہو گیا مگر اسکوٹر
کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ تیز قسم کا شور چاروں طرف سائیں سائیں کرنے لگا۔
سانسیں جیسے بے ترتیب نکلنا چاہتی تھیں۔ ابھی ہم گھر سے چند گز پرے ہی تھے
کہ ایک پتھر بڑے زور سے آکر دلیر بھائی کے ماتھے پر لگا اور وہ بے چارا
ہائے کہہ کر گر پڑا۔ خون کا فوّارہ چھوٹ گیا تھا۔ میرے منہ سے یک لخت دردناک
چیخ نکل گئی ــــ "ہائے......" پکار سنتے ہی میرے ڈیڈی، بھیا ہمارے
پاس پہنچ گئے۔ دلیر بھیا کو ڈیڈی جھٹ اندر کمرے میں لے گئے، کیونکہ کافی خون نکل
گیا تھا...... ایک معصوم انسان کا خون۔

ہمارے مکان کی دوسری منزل پر رہ رہے ڈاکٹر انکل کو فوراً بلوا کر
فوراً مرہم پٹی کروائی گئی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے میرا سارا شریر تھر تھر کانپ رہا تھا۔
مَیں نے ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرا دل جل رہا ہو...
.....سارا شہر جل رہا ہو۔

آپ بیتی سُناتے سُناتے اُس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو چھلک
پڑے جو مجھے بھی رُلا گئے... اس کو دلاسہ دیتے ہوئے میں نے کہا... انسانی شکل والے

اِن درندوں نے ہنستے گلستاں پھونک ڈالے ..... وقت کی تختی پر گرے ہوئے خون کے دھبوں کو آنے والی نسلیں ہرگز فراموش نہیں کریں گی۔ اور تاریخ ایسے بے رحم مجرموں کو معاف نہیں کرے گی۔ آج کا انسان بارود کے ایک بڑے ڈھیر پر کھڑا ہے جو کسی وقت بھی جوالا مُکھی بن سکتا ہے۔ کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ پڑے، اور ان میں بلکتا ہُوا بچپن، سِسکتا ہُوا بڑھاپا اور تڑپتی ہوئی جوانی تیرنے لگی، اور میرے منہ سے ایک سرد آہ نکلی ؂

آدمی کے ہاتھوں سے مر تا رہا ہے آدمی　　　آخر یہ خودکشی کب تک کرے گا آدمی

ہماری بس اُس وقت میڈیکل کالج کے قریب سے گزر رہی تھی...... شام کی مانگ میں سندور دُور تک بکھرا ہوا تھا۔ اور اب روشنی کو اندھیرا جذب کر رہا تھا۔ غروب آفتاب کے بعد مغرب کا نصف آسمان دُلہن کے حِنائی ہاتھوں کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ اُس کو مزید تسلی دیتے ہوئے میں نے کہا ــــ "بیٹیا مُصیبت میں گھبرایا نہیں کرتے۔ ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔ اگر سنسار میں رنج و غم، دُکھ سُکھ، سچ اور جھوٹ، نیکی اور بدی، پاپ اور پُنیہ نہ ہوتے تو پھر یہ رامائن، وید اور گرنتھ نہ ہوتے۔ کالے کالے بادلوں کے پیچھے چمکدار سورج نہ ہوتا۔ اور ہر رات کا سویرا نہ ہوتا۔

دفعتاً ایک جھٹکے کے ساتھ بس ڈیڈ اسٹاپ ہوگئی۔ پٹیالہ بس اسٹینڈ پر وہی پہلے والی رونق تھی، چہل پہل کو دیکھ کر اس لڑکی کے دل کا کنول کھِل اُٹھا میں ابھی اس کے گھر کا اتہ پتہ تفصیل سے پوچھ ہی رہا تھا کہ کسی نے میرے پیچھے سے آکر میرے کندھوں کو ہلکی سی جنبش دی۔ فوراً وہ لڑکی پکار اُٹھی ــــ "ڈیڈی! اِن انکل کو جانتے ہیں۔ بڑے اچھے انکل ہیں نہ،،

"ہاں ریکھا بیٹی! یہ سچ مچ اچھے اور میرے پیارے مِتر ہیں.....،،

اور ہم دونوں ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر بچھڑ گئے کیونکہ میری منزل اور بھی دُور تھی اور بس اسٹارٹ ہوگئی تھی۔

اُدھار کی زندگی

وقت کے تھپیڑوں سے پامال، فاقوں کا ستایا ہوا بُجھا بُجھا سا چہرا، صاف بتا رہا تھا کہ منگلو نے غریبی کی کوکھ سے جنم لیا۔ اور آج تلک افلاس کے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا...... افلاس کو نیلام نہ کیجئے سرِ بازار..... دُنیا میں یہی جنس تو انمول رہی ہے۔ الڑکپن میں اُس کو کھلونے نہ ملے، اور جب جوانی آئی تو محرومیوں و مایوسیوں کے ہجوم کے ساتھ آئی۔ اور بڑھاپے سے اُس کی جلد ملاقات ہوئی۔

بازاروں میں بھاری بوجھ ڈھوتے ڈھوتے اب اُس کی انتڑیاں کھنچ گئی تھیں اور شریر ٹوٹ چُکا تھا...... نہ چہرے پر رنگ روپ، نہ خوشحالی کی مسکراہٹیں رہی۔ ...... ناکافی خوراک، تھکاوٹ سے چُور چُور کر دینے والا دن بھر کا سخت کام..... ہونٹوں پر تفکرات کی چُپ نے پپڑیاں جمائی تھیں........ لیکن اُس روز جب اُس نے سُنا کہ اُس کی بیوی نے بیٹے کو جنم دیا ہے، تو خوشی کے مارے اُس کے سارے بدن میں خون کی تیز لہر سی دوڑ گئی۔

جس کے لئے اس نے دس برس تک کٹھن تپ کیا تھا، اور اپنی اکلوتی مزدوری کے سہارے گھر کی گرہستی کچھوے کی چال کی طرح چلاتا آرہا تھا، اُس دن بیٹے کی شکل میں بھگوان کا آشیرواد پاکر اُس نے ایشور کا لاکھ لاکھ شکرا دا کیا تھا اور فوراً بھاگا بھاگا وہ شومندر پہونچ گیا۔ اور کافی دیر تک اپنا ماتھا رگڑتا رہا تھا۔ اور جب بچے کا نام سنسکار ہوا تو اس کا نام انہوں نے برجور رکھا....!

برجو جب ٹھمک ٹھمک کر چلنے لگا تو اُس کی ماں نے اپنی چاندی کی پازیب کو تڑواکر اُس کے پیروں کے سائز کی پازیبیں بنواکر پہنادی تھیں۔ دن بھر کا تھکا ماندہ منگلو جب گھر آتا تو اُسے گود میں اُٹھا کر پیار سے گلے لگالیتا. تب اُس کی ساری تھکان دُور ہو جاتی اور ٹوٹا ہوا بدن ہلکا پھلکا ہو جاتا۔

اور پھر دیکھتے دیکھتے برجو اسکول بھی جانے لگا تھا. ویسے ایک مزدور کے پسینہ کی اُجرت ہوتی ہی کتنی ہے ؟ بھلا کیا آمدنی تھی بے کس غریب بیچارے کی. لیکن گھاس پھوس کی جھونپڑی میں اُدھار کی زندگی بسر کرنے والے غریب منگلو کی آنکھوں میں بھی ایک سنہرا سپنا تھا اپنے برجو کے لئے........ اُس کے مستقبل کے لئے۔ آخر وہ ایک باپ تھا، غریب ہوا تو کیا...... وہ بھوکا رہ کر بھی اپنے خواب کی تعبیر کیلئے سر توڑ کوشش کرتا رہتا.

برجو کی سالگرہ پر سوا روپیہ، کچھ پھول اور بتاشے لیکر اُسے اُجلے کپڑے پہنا کر منگلو گود میں اُٹھا مندر لے جاتا. پھول، پرشاد بھگوان جی کی مورتی پر چڑھاتا. اور پیسے پُجاری کو دیتا. بدلے میں پُجاری برجو کے سر پہ ہاتھ پھیر کر عمر درازی کے لئے آشیرواد دیتا. اور منگلو واپسی پر راستے میں بلّو حلوائی کی دُکان سے بیسن کے دو لڈّو دلوا کر اُسے چُومتا ہوا گھر لے آتا.

ایک دن گرمی کی شدّت کی وجہ سے، جب منگلو ایک ٹرک پر بھاری بوریاں لاد رہا تھا، اُس کی آنکھوں میں آندھیرا چھا گیا، اور وہ بوری لئے ہی دھڑام سے زمین پر گر پڑا تھا. اُس کے ساتھی مزدوروں نے فوراً اُس کی پیٹھ پر سے بوری پرے سرکا کر جب اُسے سیدھا کیا تو اُس کی پتھرائی آنکھیں خلا میں کسی سپنے کو دیکھ رہی تھیں. مُنیا کی تقدیر کے اُجالے سمیٹ کر منگلو ابدی نیند سو گیا تھا...... مزدوروں نے کام بند کر دیا تھا......!

اور برجو جب سکول سے آیا تو اپنے پتا کو زمین پر بےحس و حرکت لیٹا ہوا دیکھ کر سہم سا گیا. ماں کو بُری طرح روتے ہوئے دیکھ کر وہ ایک اُلجھن میں

پڑ گیا........ "ماں آج کیوں رو رہی ہے، اور باپو تو دن میں کبھی نہیں سوتے........ اور جب سوتے ہیں تو مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر لاڈ پیار کرتے ہیں۔"

وہ گُم سُم ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا...... ماں نے برجُو کو اپنی گود میں کھینچ کر ایک دردناک چیخ ماری تھی اور رُندے ہوئے گلے سے کہا........

"دیکھو نا! برجو کے باپو، یہ آگیا ہے تمہارا لاڈلا...... کیا اسے گود میں لے کر آج پیار نہیں کرو گے........؟"

اُس کے مستقبل کے لئے کیسے کیسے سنہرے خواب آنکھوں میں سجائے تھے بے چاری ماں نے۔ لیکن آج اُس کے سارے سپنے ٹوٹ گئے تھے۔ خوابوں کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ارمانوں کی دنیا اُجڑ گئی تھی۔ اب وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ زمین کے ذرّے عرش کے تارے کبھی نہیں بن سکتے...... جھونپڑیوں میں رہنے والے تو بس خواب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ان کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے........ خاک نشینوں کے خواب بھی خاک ہی میں مل جاتے ہیں۔ یہ تو پیدا ہی سِسکنے اور بلکنے کے لئے ہوتے ہیں۔ غم کھانا اور آنسو بہانا ہی ان کا مقدر ہوتا ہے.......!

برجُو کی ماں وِلاپ کرتی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ دنیا کے مالی سے گِلے شکوے کر رہی تھی۔ آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ دل کا طوفان تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کا دل زخمی پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا...... ...... اڑوس پڑوس کی عورتیں اس کو حوصلہ دینے کے جتن کر رہی تھیں......!

تبھی باہر اکٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک بزرگوار نے آکر نہایت حلیمی سے کہا ــــ "مُنیا بیٹی، کب تک اسے بلائے گی۔ یہ تو ہم سب سے روٹھ گیا ہے رے...... اب تم سب جھونپڑی سے باہر آجاؤ...... دیکھو دن ڈھل رہا ہے۔ اُسے نہلا دھلا کر انتم سنسکار کیلئے لے جانا ہے......!"

مُنیا سِسک رہی تھی۔ بے چارا برجو روتی، بلکتی ماں کو، کبھی زمین پر پڑی

باپ کی لاش دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔! سورج غروب ہونے سے پیشتر ہی منگلو کا شریر نذرِ آتش کر دیا تھا۔ برجو نے ایک بزرگ کے کہنے پر دہکتی چتا میں سر کیطرف جب ارتھی کا بانس چھُوا کر پرے پھینکا تھا، تب اُس کی آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے آنسو اُمڈ آئے تھے۔۔۔۔۔۔ اَور آسمان کے کسی کونے میں لٹکا منگلو کا سنہرا سپنا ٹوٹ گیا تھا۔۔۔۔۔۔!

وقت بڑا بے رحم ہوتا ہے یہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔۔۔۔۔۔۔ بے چاری مُینا نے منگلو کی موت کے بعد چند بڑے گھروں میں برتن مانجھنے اور جھاڑو صفائی کا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔۔۔۔ اور بس زندگی اسی ڈگر پر چلنے لگی۔۔۔۔۔۔! وہ برجُو کو پڑھا کر منگلو کا سپنا سچ کر دکھانا چاہتی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ برجُو پڑھ لکھ کر اچھی نوکری کرے گا۔۔۔۔ میری طرح محنت مجوری نا ہی۔۔۔۔۔ دیکھ لینا۔ ایک دِن اپنی میّا کو جھُولے میں جھُلائے گا۔۔۔۔!

لیکن بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ ظالم موت سامنے کھڑی ہنس رہی ہے۔۔۔۔۔ جانے والے چلے جاتے ہیں۔ دُنیا کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔ چیخوں کی جگہ آنسو، اَور آنسوؤں کی جگہ آہیں لے لیتی ہیں۔ پھر یہ آہیں ٹھنڈی سانسیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد یہ ٹھنڈی سانسیں بھی فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ اور وقت کے صحرا میں زندگی کا دریا کہیں جذب ہوتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔!

مُنیا ایک گھر کا کام ختم کر کے ابھی ابھی دوسرے گھر میں برتن مانجھنے بیٹھی ہی تھی، کہ سوچوں نے اُسے آگھیرا۔ وہ دل ہی دل میں حساب لگاتی جارہی تھی۔۔۔۔۔۔ تنخواہ ملنے کا ایک دن رہ گیا ہے، اور اُدھر ضرورتیں مُنہ کھولے اُس کے پاس آکے کھڑی ہونے لگیں۔

ابھی وہ ضرورتوں کی ہتھیلی پہ بڑی احتیاط سے گِن گِن کے پیسے دے رہی تھی، اور کِسی کِسی ضرورت کو اپنے پاس سے الگ کر کے جھڑکتی بھی جارہی تھی

کہ مالکن کی کرخت آواز نے اُس کی سوچ کے دھاگوں کو ایکدم توڑ دیا. کل ملنے والی تنخواہ کے سارے پیسے اُس کے خیال کی مُٹھی میں سے گر کر اِدھر اُدھر بکھر گئے........ اُسے فوراُ برجو کا خیال آیا....... سکول سے چھٹی ہونے کا ٹائم ہو چکا تھا...... نجانے اُس نے کچھ کھایا بھی کہ نہیں.... بس جلدی جلدی کام ختم کر کے وہ گھر کو ہولی.

گھر پہونچی تو دیکھا کہ برجو کھٹولے پر لیٹا سو رہا تھا. اور اُس کا لبستہ نزدیک ہی زمین پر پڑا ہوا تھا. مُنیا نے نزدیک پہنچ کر بڑے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مہین سی آواز میں پیار سے پُکارا ــــ "بیٹا برجو! اُٹھو کچھ کھاپی لو ـ دیکھو، تمہارے لئے آج کیا چیز بنائی ہے. ! دوسرے ہی لمحہ اُس نے آنکھیں کھولدیں اور ماں سے لپٹ گیا......!

اسکول کا کام ختم کر کے رات کو جب برجو سونے کیلئے لیٹا تو ماں نے ٹانکیاں لگی پُرانی گُدڑی اُسے اُڑھادی. اور گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی. کافی رات گئے جب کام دھندے سے فارغ ہوئی تو خود بھی اُس کے پاس جالیٹی برجو اس کے اور قریب ہو گیا. ماں سے چمٹ کر وہ سوچنے لگا کہ بابا ہمیں اکیلا چھوڑ گئے. اور ماں اب بہت ٹوٹ چکی ہے. اتنا کام کرنا اب اُس کے بس سے باہر ہے. لہذا کیوں نہ وہ فالتو ٹائم میں بس اسٹینڈ پر جا کر بوٹ پالش کر کے کچھ پیسے بنا لیا کرے. پھر چند دنوں بعد جب کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو اسکول کے قریب کاپی، پنسل ربڑ وغیرہ بیچنے کا کام شروع کر دے گا .... پیسے بھی بنیں گے اور ماں کو بھی اس طرح سہارا ملے گا........

بس اسی طرح کی اُلٹی سلٹی باتیں سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی.....!

اور جب نور کے تڑکے وہ ہڑبڑا کر جاگا، تو ماں گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور پوچھنے لگی ــــ "کیا کوئی گندہ، بُرا سپنا دیکھا ہے رے.........؟"

"نہیں ماں، بس نیند میں مجھے یوں لگا جیسے میرے پاس نئی سائیکل ہے اور میں نے اخبار بیچ کر ڈھیر سارے پیسے بٹور لئے ہیں۔ اور تیرے کو کہہ رہا تھا کہ اب تجھے کام پر جانے کی جرورت نا ہی۔ یہ دیکھو میں کتنے پیسے کما لیتا ہوں........!" ماں نے اپنے مستقبل کو جھٹ چھاتی سے لگا کر منہ چوم لیا ——

"ارے بوا، گریبوں کی تکدیر میں جو سُکھ نا ہی ہوتے وہ اُن کو سوتے سوتے سپنوں میں ہی ملتے ہیں ——!!"

●●

ٹھنڈی آگ

راجن کی بڑی بڑی آنکھیں اخبار کے چھوٹے چھوٹے کالے لفظوں کو گھور رہی تھیں کہ دفعتاً نرملا نے اخبار جھپٹ لیا۔ اور ذرا بگڑ کر بولی ــــ "اجی حضور! اس شربت کے گلاس کو رکھے کل کو دو روز ہو جائیں گے۔ اور تم ہو کہ کسی دوسری طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیتے۔ اخبار کیا مل گیا، نور محل کی سرائے ہو گیا جو نظریں ہٹاتے نہیں ہٹتیں.........!" ساڑی کے پلو کو جھٹکارتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں جانے لگی۔

"اُف! ایک تو بلا کی گرمی اور اُوپر سے تمہارا یہ غصّہ....... حرارت دوگنی ہو جاتی ہے۔ شربت پینے سے بھلا گرمی تو کم نہیں ہو جاتی۔ اور پھر سارا دن شربت پیتے پیتے پیٹ بھی تو ڈھول بن جائیگا۔ کہاں تک نبھے گا اس طرح۔!" ماتھے کو پونچھتے ہوئے راجن نے کہا......" میں تو اس ظالم گرمی سے تنگ آ گیا ہوں....... جی چاہتا ہے بس آج ہی شملہ چلا جاؤں.......!" اُچٹتی سی ایک نظر اپنی سُندر مُکھی عُرف جوالا مُکھی پر ڈالتے ہوئے راجن نے پھر کہا......!

نرملا پھر جھٹ سے سامنے آ کھڑی ہوئی اور تیور بدلتے ہوئے بولی ــــ "واہ! تم مرد لوگ بھی خوب ہو، سردی ہوتی ہے تو گرمی کے گُن گاتے ہو اور جب گرمی آتی ہے تو اُسے ظالم اور رُبرا بتاتے ہو۔ کہیں چین بھی ہے تم لوگوں کو.........!"

"اجی، اتنا بگڑتی کیوں ہو۔ تم بھی ساتھ چلی چلنا........!"

"ناں بابا نا .... تمہارے تو نت نئے پروگرام ہوتے ہیں، کبھی یہاں جانا ہے، اور کبھی وہاں........"

"نیلے آکاش کو چومتی ہوئی اونچی اونچی پربتوں کی قطاریں۔ گنگناتے ہوئے جھرنے۔ چنچل ہوا کی ترنگوں پر تیرتا ہوا ہمارے جیون کا سنگیت...... شملہ کا مال روڈ اور سکینڈل پوائنٹ، یہ سب دیکھ کر ایک بار تو اس دنیا کو بھی بھول جاؤ گی، اور تم دیکھو گی کہ جو سچا سکھ اور شانتی پہاڑوں کی گود میں جنگلی درختوں کے سائے تلے ملتا ہے۔ وہ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں اور شور شرابہ والے بازاروں میں بھلا کہاں ہے؟" راجن نے نہایت نرم و پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

"جی نہیں......... میں ہرگز تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" نرملا جھنجھلا کر بولی۔

"بھلا کیوں.........؟"

"مرضی میری!"

"اچھی بات........ جیسی تمہاری مرضی........ ہاں البتہ میں یہ دعوے سے کہے دیتا ہوں، کہ تم آج نہیں تو کل، اور کل نہیں تو پرسوں، ایک نہ ایک دن ضرور میرے پاس بھاگی آؤ گی۔"

"اونہہ.........! کبھی نہیں........ تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے بنا اکیلی نہیں رہ سکتی........!"

"دیکھ لینا۔"

"اچھا، دیکھ لیں گے........ مگر ہاں اتنی مہربانی ضرور کرنا میرے حال پر، کہ اپنی بیماری کا جھوٹا تار نہ دے دینا۔ کہیں صبح صبح ہی مجھے آنا پڑ جائے آپ کے پاس۔"

" بالکل نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ لیکن سرکار، تم تو خود ہی کھنچی چلی آؤ گی کچے دھاگے سے.........." مقناطیسی لہجے میں کہتے ہوئے راجن بابو اُٹھ کھڑے ہوئے اور معنی خیز مسکان کی بوچھاڑ سے اُس شعلہ کو ٹھنڈا کرنے کا جتن کرنے لگے........! یکا یک نرملا کا چھوٹا بھائی نریندر بغل میں کتابیں دبائے اُس کمرے میں آدھمکا۔ نرملا فوراً کچن میں چلی گئی اور سبزی والی پتیلی میں کڑچھی پھیرنے لگ گئی۔ نریندر کے موڈ کا بغور جائزہ لیتے ہوئے راجن نے مسکرا کر پوچھا۔

" کیوں بھئی نریندر، تم میرے ساتھ شملہ چلو گے یا اپنی دیدی کے پاس یہیں رہو گے۔؟"

" جی، مَیں تو...... اپنی دیدی کے پاس ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔" کتابیں اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

" اچھی بات...... تو ہم کل ہی شملہ چلے جائیں گے.....!"

" ہماری طرف سے تو کل کے جاتے آج ہی چلے جاؤ۔ بھلا کسی نے روکا ہے۔" نرملا نے طنزیہ لہجے میں کہا....... یوں کہنے کو تو اس نے یہ الفاظ کہہ دیئے مگر نرملا کا دل کسی مسمار محل کے ملبہ کی طرح ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اور وہ ماضی و مستقبل کے ملے جُلے دُھندلکوں میں کھو سی گئی......!

اور پھر اگلے روز راجن چلا گیا۔

چند روز بعد نریندر کو راجن کا ایک خط مِلا، جسمیں تحریر تھا..........

پیارے نریندر!

خوش رہو۔

حالانکہ مجھے یہاں آتے کئی روز ہو گئے، مگر لگتا یوں ہے کہ جیسے ابھی کل ہی آیا ہوں۔ یہ سرسبز پہاڑ، اُونچی نیچی گھاٹیاں، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں، جھُومتے ہُوئے درخت اور جھاڑیاں۔ چھل چھل کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے جھرنے پُرلطف نظارہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں مسرت کی دیوی اپنا خوشی کا دامن چاروں

طرف پھیلائے مسکراتی ہوئی گھومتی پھرتی ہے۔ یہاں صبح کے وقت کی دلکشی اور مال روڈ کی انگوری شام کی رنگینی زندگی کی رونق بڑھاتی ہے۔ پربتوں کے یہ پشو پکشی بھگوان کے زیادہ قریب ہیں۔ ان میں چھل کپٹ نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ کوئی پاپ کرتے ہیں۔ ان میں آدمی کا سا جھوٹا غرور اور گھمنڈ قطعی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اصلی معنوں میں زندگی کا لطف تو بس یہاں پر ہی ملتا ہے۔ خوب مزے کی کٹ رہی ہے۔ اور ایک مزے کی خاص بات یہ ہے کہ میرے پڑوسی خوش مزاج آفیسر کی بیٹی کلپنا میری دوست بن گئی ہے۔ وہ زیادہ تر اپنا وقت میرے پاس ہی گذارتی ہے۔ ہم دونوں اکٹھے ہی چائے پیتے ہیں، مال روڈ پر سیر کرنے جاتے ہیں۔ اور سینما دیکھنے بھی دونوں ہی ساتھ جاتے ہیں۔ اس کی بھولی بھالی باتیں، گول مٹول مسکراتا ہوا معصوم چہرہ، اور گوری گوری گردن میں کالی سنپولینوں کی طرح لال ربن والی دو چوٹیاں مجھے بہت پیاری لگتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے لو، وہ دیکھو کس انداز سے اتراتی، اٹھلاتی اور مسکراتی چلی آرہی ہے۔ اب وہ مجھے خط نہیں لکھنے دے گی، بہت جلد خفا ہو جاتی ہے لہٰذا خط یہیں بند کرتا ہوں۔ باقی پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

شبھ چنتک ـــــ راجن

خط ختم ہوتے ہی نرملا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے چباتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر بڑبڑانے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"ہے ایشور! یہ کم بخت چڑیل کلپنا کہاں سے آ گئی جو میرے راجن کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

عورت اپنے شوہر کے ہر ظلم و ستم سہہ جاتی ہے مگر غیر عورت کا سایہ تک بھی اس کے پاس برداشت نہیں کر سکتی، اور پھر سوتن تو مٹی کی بھی بُری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

چنانچہ کسی کیمیائی خیال کے زیرِ اثر اس نے نریندر کو فوراً ایک خط تحریر کرنے کی تاکید کی، اور اس موئی کلپنا کے بارے میں پوری تفصیل سے دریافت کرنے کو کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اگلے روز راجن کا دوسرا خط بھی آگیا۔ جس میں اُس نے کلپنا کی تعریف کے پل باندھ دیئے......اَور لکھا کہ کلپنا اس سے اِس قدر پریم کرتی ہے کہ ایک پل بھی جُدا رہنا پسند نہیں کرتی۔ دونوں کافی رات تک تاش کھیلتے رہتے ہیں، اور کئی بار تو گپیں ہانکتے ہانکتے اسی کمرے میں سو رہتی ہے.......

یہ سُنتے ہی نرملا آگ بگولہ ہوگئی، نتھنے پھول گئے اور وہ بڑبڑانے لگی.... اُف، اب تو حد ہوگئی...... یہ مرد لوگ بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں اس قدر جلدی اپنی بیویوں سے اُکتا جاتے ہیں، اور پُرانے فرنیچر کی طرح نظر انداز کر دیتے ہیں.. شاید اسی بل بوتے پر مجھے خود بخود کھینچی چلے آنے کا طعنہ دیتے تھے........ اور پھر سوچ کی گہرائیوں میں غرق ہوگئی........ مگر دفعتاً چونک کر بولی..............

" بھیّا نریندر! ہمیں آج ہی شملہ کے لئے روانہ ہوجانا چاہیئے۔ کہیں ایک دو روز میں کچھ اَور ہی گُل نہ کِھل جائے......!"

نریندر نے سر ہلا کر تائید کی، چنانچہ اسی روز شام کی گاڑی سے شملہ روانہ ہوگئے۔

سفر میں تمام راستہ نرملا ایک گھٹن سی محسوس کرتی رہی۔ تیز رفتار وقت کے ساتھ ساتھ دوڑ لگاتی، جیون کے بھید بتاتی، گاڑی بھاگی چلی جارہی تھی.... نرملا کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وقت تو ضرور بھاگ رہا ہے۔ مگر اس کی زندگی بند کلاک کے پنڈولم کی مانند ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہے۔ اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب سا فساد ہوتا رہا تھا........ اور گاڑی سلسلہ کوہ کو چیرتی ہوئی، پہاڑوں کے سینوں کو روندتی، اور طوائف کے مستقبل کی طرح تاریک سرنگوں کو پار کرتی ہوئی شملہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے جا لگی........ گاڑی کا جھٹکا لگتے ہی نرملا کے خیالات منتشر ہوگئے.... اور پھر منٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ ڈی لکس ہوٹل کے گیٹ پر تھے...... ہوٹل کی دوسری منزل پر پہونچنے کے لئے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے نرملا کے قدم اس طرح لڑکھڑا رہے تھے جیسے کوئی جواری اپنا سب کچھ ہار کر، ڈگمگاتا ہوا گھر کی طرف بڑھ رہا ہو......... کمرہ نمبر ۱۱ کے دروازے پر دستک دی،

جواب نہ ملنے پر ہلکا سا دھکا مارا .... اور دروازہ جھٹ کھل گیا اندر کمرے میں راجن اور ایک لڑکی بیٹھے ہوئے کچھ کھا رہے تھے۔ نرملا بھری ہوئی شیرنی کی طرح اُنہیں گھورنے لگی .... نرملا کو دیکھتے ہی راجن بابو ایک دم کھڑے ہو گئے۔ اور دروازے کی طرف دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے ہوئے زیرِ لب مسکرا کر بولے ......" او ہو! آپ آخر آ ہی گئیں نا....... مَیں نہ کہتا تھا کہ ...... چلو اچھا ہوا۔ آؤ تمہیں اپنی دوست کلپنا سے ملاؤں ....!"

یہ کہہ کر وہ اُس خوبصورت لڑکی کی طرف بڑھے جو صوفہ پر بیٹھی ایک انوکھے انداز سے نرملا کو تک رہی تھی۔ راجن نے اس لڑکی کا بازو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے کہا — "یہ ہے میری پیاری کلپنا..... !"

" ایں ...... کیا یہ وہی کلپنا ہے جس کا ذکر آپ اپنے خط میں کرتے رہے ہیں ....؟"

نرملا کا جسم جو تھوڑی دیر پہلے غصّے کے مارے کانپ رہا تھا، اس سات سالہ بچّی کو دیکھ کر سوالیہ نشان کی مانند ساکت ہو گیا، اور مُنہ کھُلے کا کھلا رہ گیا .... !

" دیکھا! آخر ہم جیت ہی گئے نا........" دبی نگاہوں سے نرملا کو دیکھتے ہوئے راجن نے مُسکرا کر کہا۔ اور پھر ذرا چھیڑنے کی غرض سے اُس کا ہاتھ دبا دیا.........

نرملا نے جھٹکا مار کر اپنا بازو کھینچ لیا۔ اور دوسری طرف مُنہ پھیر کر کنکھیوں سے راجن کو دیکھتے مُسکان بکھیرتے ہوئی بولی — "ہٹو جی، تم بڑے وہ ہو — !"

اَور پھر دوڑ کر کلپنا کو اُٹھا لیا اور زور سے کھینچ لیا............!!

●●

سوگوار جوانی

جب ہم نور پور پہنچے تو کھانا کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کھانا ہمارے پاس تھا اور بس یہاں پر کافی دیر رُکی اور ہم نے چٹخارے لے کر خوب پیٹ بھر کھایا۔ جب نور پور سے چلے تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ لیکن سورج آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ کیونکہ کالے بادل اُمڈ آئے تھے۔ بس ایک پہاڑی کے گرد گھوم رہی تھی۔

پہاڑوں کی گود میں نور پور کا وہ خوبصورت قلعہ، جسے وہاں کے لوگ ملکہ نور جہاں کے نام سے منسوب کرتے ہیں، بس کی کھڑکی سے نہایت ہی طلسمی اور پُر کشش لگتا تھا۔ پہاڑ کے سینے کو روندتی اور سرسبز وادیوں کے کلیجے چیرتی آخر چار بجے کے قریب بس منزل مقصود پر جا پہنچی۔

مدن تو بس سے سامان اُتروانے میں مشغول تھا، اور میں قدرت کی گود میں ایک عجیب آنند محسوس کر رہا تھا...... اُونچی اُونچی چوٹیوں پر بڑے بڑے درخت سیدھی قطاروں میں اس طرح کھڑے تھے، جیسے کسی حسین شہزادی کی آمد پر محل کی لونڈیاں استقبال کرنے کے لئے باادب کھڑی ہوں۔ یکایک مدن نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا — "پہلے گھر پہونچ لو، پھر چاہے سارا دن دیکھتے رہنا ان نظاروں کو۔"

مدن اور بھابی آگے آگے تھے، اور میں اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اسپتال چوک پر گلی کے نکڑ والے مکان کے سامنے پہونچ کر مدن نے کسی

کو پُکارا۔ میں ذرا پرے ہی گلی کے سِرے پر کھڑا رہا۔ اُس مکان سے نہ ہی تو کوئی باہر نکلا اور نہ ہی کوئی جواب ملا۔ ہاں البتہ اس مکان کے سامنے والی کھڑکی جھٹ کُھل گئی تھی، جیسے پہلے ہی کوئی بیٹھا انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ اور پھر ایک گورا گورا گول مٹول مُکھڑا کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ نگاہیں ملتے ہی ٹکٹکی لگ گئی۔ مگر فوراً کسی خیال کے زیر اثر نظریں خود بخود جُھک گئیں۔ اور ادھر جھٹ کھڑکی والی نے مخمل جیسی نرم آواز میں پُکارا ــــ "چاچی جی........ ذرا باہر تو آؤ۔ دیکھو تو مہمان آئے ہیں"...... اور پھر دروازہ کُھل گیا۔ ایک اُدھیڑ عمر کی عورت نے بڑے تپاک سے ہمیں اندر لا بٹھایا۔

مَیں اور مدن باہر والے کمرے میں کچھ اس ڈھنگ سے بیٹھے تھے، کہ مدن کا مُنہ اور میری پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ لہٰذا اندر آنے والوں یا والیوں کی صورت سے میں تو محروم رہتا، البتہ مدن صاحب اپنی آنکھیں خوب سینک رہے تھے۔ دفعتاً کسی نے نہایت ہی سُریلی مگر شرمیلی آواز میں "نمستے" کہا۔ اور مدن نے مُسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے پیچھے کی جانب دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ لہٰذا نیچی نگاہیں کئے خاموش بیٹھا رہا۔ لیکن جب نمستے کہنے والا........ نہیں ــــ کہنے والی میرے سامنے والے کمرے میں داخل ہونے لگی تو کمبخت نگاہیں خود بخود اُبھر اُٹھ گئیں.

.... اور وہ بھی ذرا رُک گئی نظریں چار ہوگئیں۔ نہایت معصومانہ انداز سے میری طرف دیکھتے ہوئے اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھوں کا جادوئی اثر اس قدر بڑھا کہ مجھے نشہ سا محسوس ہونے لگا...... اور کالج کی زندگی کا وہ رنگین واقعہ جب میری کلاس فیلو نلنی نے اسی قسم کے بھولے انداز میں مجھے نمستے کہی تھی۔ دل میں چٹکیاں لینے لگا........ اور وہ، چلی گئی۔ وہ وہی کھڑکی والی تھی.

شام کو جب ہم سیر کے لئے نکلے تو نیلے آکاش کے راجہ چاند کی چاندنی

بڑے ناز کے ساتھ چاروں طرف مُسکراہٹیں بکھیر رہی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کے چکرورتی چندرما کا راج ہے۔ ستارے خوشی میں جھُوم رہے تھے۔ اور ہوا بھی خوشگوار تھی۔ میں ان لوگوں سے ذرا الگ ہو کر ایک پہاڑی پر جا پہونچا۔ وہاں ایک دلکش نظارہ تھا۔ چاروں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ گم مُسم کھڑے تھے۔ ساری کائنات خاموش تھی کبھی کبھی کہیں دُور.... بہت دُور کسی کے گانے کی دھیمی دھیمی آواز پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی فضا میں پھیل جاتی۔ گانے کے بول تو سمجھ میں نہیں آتے تھے البتہ اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ گانے والے کی آواز میں سوز ہے اور درد بھی۔

جب ہم گھر لوٹے تو مجھے بے حد تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ انگ انگ درد کر رہا تھا۔ اور سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ چنانچہ چارپائی پر لیٹتے ہی نیند نے آغوش میں لے لیا۔ اور صبح کو جب آنکھ کھُلی تو اُس وقت سورج کافی اُوپر چڑھ آیا تھا۔ مدن اور دوسرے لوگ مجھ سے پہلے اُٹھ بیٹھے تھے۔ میں جب اُٹھ کر باہر نکلا تو سامنے والی کھڑکی کی طرف اتفاقیہ نظریں جا پڑیں۔ وہی بھولا بھالا چہرہ گردن جھکائے باہر کی طرف جھانک رہا تھا۔ اس نے سر کے بال بکھرائے ہوئے تھے۔ سفید ساڑی میں ملبوس وہ چینی کی گڑیا نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ لیکن اِدھر گھبراہٹ و اضطراب کے ملے جُلے اثرات میرے دماغ میں منڈلانے لگے۔ چنانچہ میں یہ سوچ کر کہ یہ جگہ غیر ہے، اندر چلا آیا، اور جلدی جلدی نہا دھو کر بغیر ناشتہ کیئے باہر گھومنے نکل کھڑا ہوا۔

دوپہر کے قریب جب واپس آیا تو کھانا کھا کر اپنا سوٹ کیس کھولا۔ دیکھا، تو کہانیوں کی فائل ہی غائب تھی۔ حیران تھا، کہ کل شام تک اس میں موجود تھی۔ لیکن آج کہاں چلی گئی.......... ؟ سوچا،

شاید مدن نے نکال لی ہوگی پڑھنے کے لئے۔ مگر جب دریافت کرنے پر اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تو میرا دل بیٹھ سا گیا۔ کئی برسوں کی محنت تھی۔ اور پھر ایک افسانہ "سرحد کے اُس پار" تو ابھی ادھورا ہی پڑا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس روز لہر اُٹھی تھی، سوچا، اسے مکمّل کر لیا جائے مگر مسودہ والی فائل ہی گُم تھی۔ آخر گئی تو کہاں گئی ...... کون لے گیا ہے؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس نے ایسی جرات کی ......؟ خدا کی قسم اس روز شام تک دل ڈوبتا رہا۔ دل کو کچھ تسلّی دینے کی غرض سے میں بھاگسو ناگ پربت کی سیر کے لئے نکل پڑا۔ ابھی کوتوالی بازار تک ہی پہونچا تھا کہ کیمرے کا خیال آیا سوچا، کم از کم کیمرہ ہی سہی، اگر فائل نہیں کچھ لکھنے کے لئے؟۔ لہذا گھر واپس آیا اور کیمرہ نکالنے کے لئے جب سوٹ کیس کھولا، تو مطلوبہ فائل سب سے اُوپر موجود تھی۔ عقل حیران تھی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا....... جو چیز تھوڑی دیر پہلے گُم تھی، اب یکایک کہاں سے آگئی۔ یہ نرالا چور آخر کون ہے۔؟ یہ چھُو منتر کا جادو بھلا کون آدمی کر سکتا ہے۔ مدن نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔ اور بھابی بغیر پوچھے نکالنے کی جرُات نہیں کر سکتی .... تو پھر یہ دلیر چور کون ہے؟

فائل اور کیمرہ سنبھالتے ہوئے ایشور کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ ورنہ میں نے تو فائل کی آس ہی چھوڑ دی تھی۔ دونوں چیزوں کو قابو کرتے ہوئے میں اپنی راہ چل دیا۔

بھاگسو ناگ شملہ کی فلک بوس پہاڑی "جاکھو" کی طرح سب سے بُلند چوٹی ہے۔ یہاں پہونچکر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان سچ مچ ایک بے نظیر سیر گاہ ہے۔ چشمے کا بہتا ہوا پانی پتھروں سے ٹکرا کر ایسی آواز پیدا کر رہا تھا کہ جیسے کسی نے کانسی کے کٹورے میں کوڑیاں ڈال دی ہوں ہری ہری گھاس کشمیری قالین کی مانند چمک رہی تھی۔ اور مست پَوَن درخت

کی ٹہنیوں سے لپٹ کر خوشی کا راگ چھیڑ رہی تھی. کبھی کبھی کسی پنچھی کی آواز فضا میں جب گونجتی تو ایسے لگتا کہ جیسے کوئی دلربا کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک کر غصّے میں ستار کے تار ہلا دے۔ یہ نظارہ بہت دلفریب تھا.

جب واپس گھر پہونچا تو شام ہو چکی تھی. میرا جسم تھکاوٹ کی وجہ سے چُور چُور تھا. بھُوک کے مارے شریر نڈھال سا ہوا جا رہا تھا. لیکن کھانا تیار ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی. سوچا کہ فائل اور کیمرہ سنبھال کر رکھ دوں. جب سوٹ کیس میں رکھنے لگا تو دیکھا کہ ہندی کا ایک ماہنامہ غائب...... ساری چیزیں اُلٹ پلٹ کر دیں. مگر وہ ماہنامہ کہیں نظر نہ آیا. میں حیران تھا کہ صرف ادبی چیزیں ہی اُڑتی ہیں. لیکن دوسری چیزیں جُوں کی توں ہوتی ہیں. معاملہ سمجھ میں نہیں آتا تھا. آخر دل نے سُجھاؤ دیا کہ کھانا کھاتے وقت مدن سے دریافت کرونگا. لیکن جب میں گُم سُم سا دوسرے کمرے میں گیا، تو بھابی نے مُسکراتے ہوئے یہ کہہ کر میری مشکل حل کر دی، کہ مینا کو تمہاری کہانی 'بھارت کا لال' بہت پسند آئی......... گم شُدہ ماہنامہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بھابی نے بتایا ــــــ "وہ کہتی تھی بہت اچھا لکھتے ہیں. نہ جانے انہیں دوسروں کے دل کی بات کا پتہ کیسے لگ جاتا ہے.........؟" مَیں خاموش تھا. مگر دل زور زور سے دھڑک کر کہہ رہا تھا ــــــ کاش! مَیں ایک اعلیٰ ادیب ہوتا. میں لکھتا اور وہ پڑھتی. میرے ہر افسانے کا موضوع پیار ہوتا، اور ہیروئن ' وہ ' ہوتی .... مگر دفعتہً مدن نے کھانا کھانے کے لئے پکار کر میرے خیالات کی دُنیا دھندلی کر دی.

کھانا کھا کر میں باہر گھومنے نہ جا سکا. کیونکہ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا اور دل بھی کمزور سا ہو گیا تھا. نہ جانے کیوں دھک دھک کی آواز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لہٰذا میں وہی ہندی کا ماہنامہ لے کر کُرسی پر جا بیٹھا، اور یوں ہی ورق گردانی شروع کر دی. ابھی چند ہی اوراق اُلٹے تھے، کہ ایک جگہ

پنسل سے اپنا نام لکھا ہوا پایا۔ نام خوبصورت حروف میں تحریر تھا۔ اور پھر جب کچھ اور اوراق اُلٹے تو دیکھا کہ جس ورق پر میری کہانی "بھارت کا لال" تھی، اس پر چھپے ہوئے میرے نام کے آگے خوشخط عبارت میں لکھا تھا ـــــ "دل کے بڑے ہی کٹھور نکلے"۔ پڑھتے ہی میرے دل کی حرکت مزید تیز ہو گئی۔ چنانچہ فوراً ماہنامہ بند کر دیا، اور چپ چاپ چارپائی پر جا لیٹا۔ لیکن رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ یہ الفاظ کس نے لکھے ـــــ؟ بھابی نے یا مینا نے...... اور کس خیال کے زیر اثر ـــــ؟ بس ایسی ویسی باتیں سوچ کر ہی اپنے دل کو سمجھاتے سمجھاتے میں خوابوں کی دُنیا میں جا پہونچا۔

اگلے روز جب مینا کو معلوم ہوا کہ ہم لوگ واپس جا رہے ہیں، تو وہ بھاگی بھاگی آئی۔ اور بھابی سے لپٹ کر گلوگیر لہجہ میں کہنے لگی ـــ "آج مت جاؤ۔ ایک دن ...... صرف ایک دن میری خاطر ہی رہ جاؤ........!"

اس کی نظریں میری طرف تھیں .... اور وہ نہایت معصومانہ انداز میں کہہ رہی تھی........ بس صرف آج کا دن ـــ! میں اپنا سامان بٹور چکا تھا۔ اپنی بُشرٹ اور پینٹ کرسی پر رکھ کر نہانے کے لئے چلا گیا۔

ہم جب چلنے لگے تو مینا کی بادام جیسی آنکھوں میں آنسو اُمڈ پڑے۔ وہ گلی کے نکڑ پر پہونچکر سُبک سُبک کر رونے لگی۔ سبھی چپ کرا رہے تھے اُسے، مگر اُس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی، جیسے کسی روتے ہوئے بچے کو پچکارنے پر وہ اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ میری آنکھوں میں بھی سیلاب آگیا تھا۔ لیکن پھر بھی خود کو سنبھالتے ہوئے نہایت نرم لہجہ میں کہا ـــ "بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے، قدرت کا اصول ہے کہ جو سورج غروب ہوا ہے وہ پھر ضرور نکلے گا۔ اور جو بچھڑتے ہیں اُن کا ملاپ دوبارہ ضرور ہوتا ہے........!" اور پھر سسکتے ہوئے میری طرف دیکھ

کر اس نے ایسے بھولے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے جیسے الوداع کہتے ہوئے پوچھ رہی ہو ـــ "پھر کب ملاپ ہو گا۔ ؟" لیکن میرے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ بس ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ دل بوجھل ہو گیا تھا آخر دل پر پتھر رکھ کر آگے کی طرف بڑھنا ہی پڑا۔

بس اسٹینڈ پر جب پہونچے تو میرا سر بھاری اور آنکھیں بوجھل سی محسوس ہو رہی تھیں۔ ٹکٹوں کے لئے بُشرٹ کی جیب سے پیسے نکالے تو نوٹوں کے ساتھ کاغذ کا ایک پُرزہ برآمد ہوا جس پر لکھا تھا۔

کٹھور چِت چور!

سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو مَیں کیا لکھوں۔ لکھنا چاہتی ہوں، وہ لکھ نہیں سکتی۔ اور جو کچھ لکھ سکتی ہوں، وہ لکھنا نہیں چاہتی۔ ہاں، صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ دل کے بڑے کٹھور نکلے۔ آپ کی کہانی سے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ بہت جلد دوسروں کے دل کو ٹٹول لیتے ہو........ لیکن کیا میرا دل، دل نہ تھا۔ کیا پتھر کا ٹکڑا سمجھا........ ؟ کون جانے اس جیون میں پھر کبھی ملاپ ہو گا یا نہیں........ یا بس یوں ہی برہا کی آگ میں جلنا ہی لکھا ہے میرے بھاگیہ میں...... ؟ کوئی غلطی مجھ سے اگر ہو گئی ہو تو معاف کرنا......!

ـــ دُکھیاری مینا

رُقعہ پڑھتے ہی جھٹ پٹ جیب میں رکھ لیا اور ٹکٹیں لے کر بس میں آبیٹھا۔ مجھے رہ رہ کر مینا کا خیال آ رہا تھا کیسی معصوم اور بھولی بھالی صورت۔ ...... مجھے اب مکمل یقین ہو گیا تھا کہ اس ہندی ماہنامے میں میری کہانی کے ساتھ چھپے ہوئے میرے نام کے آگے 'کٹھور نکلے' کے الفاظ تحریر کرنے والی مینا ہی تھی۔ کتنے ارمانوں کا خون کر کے لکھا ہو گا اُس بے چاری نے، سچ مچ میں کٹھور اور سنگ دل ثابت ہوا ہوں...... مگر چلتے وقت مینا

کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں نے میرے دل میں بھی جذباتِ محبت پیدا کر دیئے تھے۔ اور خیالات میں ایک کھلبلی سی مچا دی تھی۔ اس کے لکھے ہوئے کاغذ کے پُرزے نے پیار و محبت کا گیت سُنا دیا مجھے......!

چنانچہ بس جب چلی تو میں نے مدن سے مینا کے بارے میں کچھ دریافت کیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ پڑوسی کی لڑکی ہے۔ اور چھوٹی عمر میں ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ اور کہنے والا تھا مگر میں نے اُسے فوراً روک دیا۔ "بیوہ" کا لفظ سُنتے ہی میرا دل چیخ اٹھا تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر رہ گئیں۔ ......یہ عمر اور بیوگی........ ابھی تو اس غریب نے زندگی کی چوبیس بہاریں بھی اچھی طرح نہیں دیکھی تھیں کہ اس کی زندگی لُٹ گئی..... کتنا ظلم ہے، اور کس قدر ناانصافی........؟ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ پڑے، اور اُن میں سفید ساڑھی میں ملبوس مینا کی تصویر تیرنے لگی۔ آہ! بے چاری بھری جوانی میں ہجر کی آگ میں جلنے کے لئے رہ گئی ہے........ قدرت کی یہ ستم ظریفی کس قدر دل سوز ہے۔ یقیناً میرا دل کٹھور ہے، اور میں نے مینا کے دل کو ٹھیس پہونچائی ہے۔ وہ دل جو بیوگی کے صدمے سے پہلے ہی غم زدہ ہے اور مجبور زیست ہے...... شاید وہ جینا نہیں چاہتی۔ مگر وہ مر بھی تو نہیں سکتی۔ موت مانگنے سے یا چاہنے سے تھوڑے ہی آجایا کرتی ہے۔ آہ! یہ سوگوار جوانی۔

اس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سچ مچ میں بڑا ہی کٹھور ہوں۔ ایک لفظ بھی تسلی کا نہ کہہ سکا میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا..... اور بس ڈرائیور مستی میں جھومتا ہوا گا رہا تھا.....

مجھے جب کسی سے محبت نہیں تھی   تو آنکھوں کو رونے کی عادت نہیں تھی
محبت نے آنکھوں میں آنسو بسائے۔

●●

پریم پُجارن

رُخصت ہوتے وقت مدن نے ماں کے پاؤں چھو کر پرنام کیا۔ ماں نے پیار و محبت بھرا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ کر دُعاؤں کی بوچھار کر دی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے اور دل بھرا ہوا تھا عین اسی وقت سروج نے چرن چھو کر نمسکار کیا۔ ماں نے ڈھیروں آشیرواد دیئے......

"بیٹی! تم تو ایک دیوی ہو۔ جس گھر میں تم جیسی دیوی ہو، بھلا وہاں کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔ سورگ ہے وہ جگہ جہاں تم جیسی بہو ہو.......!"

بچھوڑے کی گھڑیاں اکثر دُکھدائی ہوتی ہیں۔ اور نوکری میں یہ گھڑیاں آتی ہی رہتی ہیں...... شادی کے ایک سال چند مہینے بعد ہی مدن کا تبادلہ جالندھر سے پٹیالہ ہو گیا تھا۔ وہاں پہونچ کر اپنے حسنِ سلوک و خوش اخلاقی کی وجہ سے مدن نے اپنے نئے آفس میں ٹھیک ڈھنگ سے جلد ہی اچھی ایڈجسٹمنٹ کر لی تھی۔ اُدھر سروج بھی ملنسار اور شیریں زبان ہونے کے کارن اپنے اڑوس پڑوس میں بہت جلد گھُل مِل گئی۔

جب مدن آفس چلا جاتا تو وہ اپنی سہیلیوں میں بیٹھ کر ہندی ڈرامے پڑھتی اور پھر سِلائی اور کشیدہ کاری کا کام سیکھتی اور سکھلاتی اس طرح سروج نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

ایک روز مدن جب دفتر سے واپس آیا تو دیکھا کہ سروج ایک بھکارن کے پاس بیٹھی کچھ سوال پوچھ رہی تھی۔ مدن کے ہاتھ میں ہندی کا ماہانہ دیکھ کر اٹھلاتی

ہوئی بولی ــــ "تو، یہ کہانیاں پڑھنے کی علت جناب کو بھی ہے ....!"

"جہاں تم جیسا جیون ساتھی ہو وہاں ایسی کئی بیماریاں لگ جاتی ہیں۔"

سروج نے اُس کے جواب کو اَن سُنا کرتے ہوئے بھکارن کو کچھ پیسے دے کر رُخصت کیا اور پھر جھپٹ کر وہ ہندی کا رسالہ چھین لیا۔ ٹائیٹل پیج پر لکھا تھا ــــ "نیا سنسار" کانپور۔

رات کو ایک دو کہانیاں اس نے پڑھ ہی ڈالیں۔ اور اگلے روز کام کاج سے فارغ ہوتے ہی 'نیا سنسار' لے کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں شاردا آ ٹپکی، اور مزاحیہ لہجہ میں بولی ــــ "آج یہ کیا لئے بیٹھی ہو، رانی جی ــ!"

"'نیا سنسار' بہت اچھی پتریکا ہے۔"

"کونسی کہانی پڑھی جا رہی ہے ــ؟"

"گدگدی ــ"

"کہانی کا نام تو واقعی غضب کا ہے، لیکھک کون ہے ــ؟"

"کوئی پریم صاحب ہیں۔"

"کہانی کیسی ہے؟"

"بس کیا کہوں شدّو! دِل چاہتا ہے کہ لکھنے والے کے ہاتھ چوم لوں۔"

"صاف کیوں نہیں کہتی کہ پیار ہو گیا ہے۔"

"اری پگلی، پیار تو صرف کہانی سے ہے۔"

"یہ تو شروعات ہے۔ دھیرے دھیرے کہانی والے سے بھی ہو جائے گا۔"

"دھت! چڑیل کہیں کی۔" اور پھر دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئیں۔

کچھ دِنوں کے بعد "نیا سنسار" کا تازہ شمارہ آ گیا۔ اس میں پریم کی "گدگدی" پر شاندار تنقید شائع ہوئی، کسی "پجارن" کے قلم سے۔

تنقید پڑھکر پریم صاحب بھی پھڑک اُٹھے تھے۔ اور فوراً خط تحریر کر کے اس "پجارن" کا اتہ پتہ دریافت کیا۔ مگر ایڈیٹر صاحب نے پتہ دینے سے

صاف انکار کر دیا۔ پریم کے دِل میں آگ سی بھڑک اُٹھی۔ چنانچہ اُس نے خوب دبا کر لکھنا شروع کر دیا۔

اب ہر شمارہ میں اُس کی کہانی چھپتی۔ اور پھر ان پر ریجارن، کی تنقید جلتی آگ پر تیل کا کام کرتی۔ قلموں کی یہ جنگ لمبے چوڑے پیمانہ پر چھڑ گئی......اِدھر پریم، کی کہانی شائع ہوتی اور اُدھر ریجارن، کی اس پر تنقید۔ اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔

پریم کی کہانیوں نے سروج پر اس قدر اثر ڈالا کہ "نیا سنسار،، کے ہر نئے شمارہ کا وہ بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار کرتی۔ اور سب سے پہلے پریم ہی کی کہانی پڑھتی۔

ایک دن سروج پریم کی نئی کہانی 'لہو کی فصل، پڑھ رہی تھی کہ اُس کی پکّی سہیلی شاردا آدھمکی۔ اور سروج کو چھیڑتے ہوئے کہنے لگی ــــ "اری پریم دیوانی! یہ تیری پُوجا کب پوری ہوگی ــــ"

" بھئی لُطف آگیا۔ پنجاب میں دہشت گردی کے دردناک سین کا نقشہ کھینچ ڈالا......! کہانی واقعی قابلِ تعریف و انعام ہے۔" سروج نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

" تیرے پریم صاحب کی ہوگی نا،،

" ہوں!"

" تو پھر بھیج دینا بیچارے کے پاس انعام"

" کیا ــــ؟"

" اپنا مچلتا ہوا یہ ننھا سا دِل۔"

" ہت، اُلّو کہیں کی۔" شاردا کے گال پر پیار بھری ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے سروج نے تنک کر کہا۔ اور پھر ذرا طنزیہ لہجہ میں بولی ــــــــ

"لے پکڑ، نہیں یقین تو خود پڑھ کر دیکھ لے......!"

"اجی دیوی جی! ہم پڑھیں چاہے نہ پڑھیں، لیکن ہمارا ووٹ تو ہمیشہ آپ کے پریم کے لئے ہی ریزرو ہے۔"

ہنسی کو دباتے ہوئے شاردا نے کہا۔

"اچھا، تو پھر لکھ دوں ایڈیٹر مہاشہ کو کہ اس شمارہ کی بہترین کہانی 'لہو کی فصل' ہی ہے۔"

"اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دینا کہ پتریکا کے اگلے نمبر میں لیکھک کا فوٹو بھی چھاپنے کی مہربانی کریں۔" یہ سُن کر سروج کچھ جھینپ سی گئی۔

کچھ دنوں بعد "نیا سنسار" کا تازہ شمارہ بھی آپہنچا۔ اس میں پریم صاحب کی فوٹو تو نہ تھی، ہاں البتہ رائے عامہ نے مسٹر پریم کی کہانی "لہو کی فصل" ضرور بہترین قرار دی تھی۔ سروج کا سر اُس کی پیشنگوئی کی فتح پر فخر کے ساتھ بلند ہو گیا۔ وہ پریم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے بے قرار سی ہو گئی۔ مگر کہاں پٹیالہ اور کہاں کانپور۔ اور ایڈیٹر صاحب تو اُس کو بس پردہ ہی رکھنے پر تُلے ہیں۔ چنانچہ مناسب موقعے کی انتظار میں چپ بیٹھی رہی ...... !

ایک دن مدن آفس سے ذرا جلدی گھر آگیا۔ سروج بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ مدن کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر جھٹ کاغذ لپیٹ کر رکھ دیئے۔ اور جب مدن نے دریافت کیا کہ کیا لکھا جا رہا تھا۔؟ تو ہنس کر بولی ــــ "کچھ نہیں، بس یونہی تھا۔" اور پھر بات کا رُخ بدلتے ہوئی بولی ــــ

"ہاں، تو وہ آپکے ماموں کے لڑکے کی شادی میں بھلا کتنے دِن رہ گئے؟"

"بس یہی ایک ہی ہفتہ تو ہے باقی۔"

"اور ہاں! وہ لوگ شادی اپنے گاؤں میں کریں گے یا کانپور میں ــــ ؟"

"کانپور ......" سروج کے نزدیک بیٹھتے ہوئے مدن نے جواب دیا۔ اور پھر اُسے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا ــــ "جانِ من! تم تو اپنی تیاری ابھی سے شروع کر دو ــــ"

اور پھر — آخر آ ہی گیا وہ دِن بھی اِک دن
گنے جاتے تھے جس دن کے لئے دن

گاڑی کا سفر لمبا تھا۔ چنانچہ مدن تو پڑ کر سو گیا۔ مگر سروج تمام راستہ یہی سوچتی رہی کہ وہ مدن سے کیسے اور کیونکر کہے کہ اُسے "نیا سنسار" کے ایڈیٹر سے مِلنا ہے۔ اور کیوں — ؟ وہ اسی ادھیڑ بن میں اُلجھی رہی حتےٰ کہ کانپور اسٹیشن آپہنچا۔ لیکن وہ بے چاری اپنے من کی بات مدن سے کہنے کی جرأت نہ کرسکی۔

ٹانگہ میں سامان رکھتے ہوئے مدن نے کوچوان سے کہا — "بھئی ذرا ہندی بازار سے ہو کر چلنا۔ اِدھر ضروری کام ہے۔" اور پھر سروج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا — "نیا سنسار" کا آفس بھی اسی راستے میں آتا ہے۔ لگے ہاتھوں ایڈیٹر صاحب سے ملاقات کرتے چلیں۔ کون جانے بعد میں ٹائم ملے نہ ملے ......"

سروج کے تو دِل کی بات کہہ دی اُس نے۔ سروج کے گلابی ہونٹ بے اختیار مُسکرانے لگے۔ پندرہ بیس منٹ کی دوڑ دھوپ کے بعد ٹانگہ ایک شاندار دو منزلہ عمارت کے سامنے آکر رُک گیا۔ دونوں اُتر گئے۔ اپنا بریف کیس اور ایئر بیگ سنبھالا اور "نیا سنسار" کے دفتر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے چُھپا کر الگ الگ کاغذ کے پُرزوں پر کچھ لکھا، اور کسی شخص کے ہاتھ اندر ایڈیٹر صاحب کے پاس پہونچوا دیئے۔ چند منٹ بعد ایک خوش پوش شخص باہر آیا، اور ان دونوں کو بڑے تپاک سے اپنے کمرے میں لے گیا۔ کُرسی پر بیٹھتے ہوئے مدن نے نہایت سنجیدگی سے کہا — "جناب، کافی مدّت سے خواہش تھی کہ آپ کے درشن کروں۔" .... اور پھر سروج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا — "یہ میری شریکِ حیات ہیں ...... یعنی دھرم پتنی۔ آپ کے پرچے کی بہت دلدادہ ہیں ....!"

ایڈیٹر نے دبی نگاہوں سے سروج کی طرف دیکھا..... اور دھیرے سے مُسکرا دیئے۔

مدن نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے نہایت آہستگی میں پوچھا —
" ہاں صاحب! تنقید لکھنے والی یہ پُجارن کون ہے ؟" ایڈیٹر صاحب خاموش رہے۔

اُدھر سروج اپنے خیالات میں غرق تھی۔ اُن کی بات ان سُنی کرتے ہوئے عین اُسی وقت بیچ میں بول پڑی — " شریمان جی! یہ مسٹر پریم صاحب کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں ؟"

ایڈیٹر نے حیران کُن نگاہوں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے ان کاغذ کے پُرزوں کو اُٹھا لیا ایک پر لکھا تھا مدن لال عرف پریم اور دوسرے پر سروج ..... (پجارن)

لمحہ بھر خاموشی کے بعد سروج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایڈیٹر مہاشے مزاحیہ لہجے میں بولے ۔

" مدن بابو! یہ ہیں آپ کی کہانیوں پر تنقید لکھنے والی — پُجارن۔" سروج شرماسی گئی۔ اور پھر سروج کو مخاطب کرکے مدن کی طرف اشارہ کرکے کہا — " یہ ہیں آپ کے پریم صاحب جن کے بارے میں آپ نے کئی لیٹرز بھی بھیجے تھے........!

مدن اور سروج ایک دوسرے کو دیکھ کر جھینپ سے گئے۔ اور پھر کِھلکھلا کر ہنس پڑے ایڈیٹر صاحب دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

اور پھر اگلے ماہ " نیا سنسار " کے تازہ شمارہ میں موٹے موٹے لفظوں میں یہ خبر شائع ہوئی — " نیا سنسار " کے کہانی کار مسٹر پریم اور تنقید نگار " پجارن " ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہوتے ہوئے بھی آپس میں ایک دوسرے کو بالکل نہیں پہچانتے۔"

گومتی کے کنارے

لکھنؤ شہر سے تقریباً پانچ میل دور گومتی ندی کے کنارے پر آباد علی پور
گاؤں کی آدھی سے زیادہ زمین ٹھاکر رام سنگھ کی ملکیت تھی۔ کھیتوں کی دیکھ بھال
کا کام رامو کے ذمہ تھا جو کہ ٹھاکر صاحب کا سب سے پرانا اور ایماندار و محنتی معمولی
سا ملازم تھا۔ کچّی پکی اینٹوں سے بنی ہوئی ایک بوسیدہ سی کوٹھری میں ہی اس
رامو نے اپنی قیمتی زندگی کے سنہرے ۵۲ سال گذار دیئے تھے اس کی تمام زندگی
وقت کی شطرنج پر پٹے ہوئے مہرے کی مانند خستہ حالی میں بسر ہوئی۔

رامو کا نورِ چشم بھی اسی کوٹھری میں پیدا ہوا تھا۔ کلوا اس کا نام تھا۔ مٹّی گارے
میں کھیل کود کر بڑا ہوا۔ اسکول کی پڑھائی میں وہ پانچویں جماعت سے آگے نہ بڑھ سکا۔
رامو نے بہت چاہا کہ کسی طرح کلوا کو آگے پڑھنے کے لئے شہر میں بھیج دے، مگر.....
ہائے رے غریبی......... تنگدستی نے مار ڈالا...... بے چارہ رامو مجبور ہو کر
رہ گیا۔

ٹھاکر صاحب اُن کے اَن داتا تھے، چنانچہ ان کی منّت سماجت کر کے کھیتوں
میں کام کرنے والے مزدوروں ہی میں اس کو معمولی اجرت پر رکھوا لیا، اور پھر اس
میں حرج بھی کیا تھا۔ غریبوں کے بچے تو بچپن ہی سے اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتے رہے
ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ان بے چاروں کی قسمت کا پانسہ پھر بھی سیدھا نہیں آتا.....!!

کلوا جب بڑا ہوا تو اپنے رشتہ داروں کی مدد سے اس نے شہر میں رکشا
چلانا شروع کر دیا۔ کچھ پیسے بنتے اور اس طرح رامو کو بھی معمولی سہارا ملنے لگا
کچھ عرصہ بعد کلوا کی شادی ہو گئی، اسی کوٹھڑی میں جہاں اس نے جنم لیا تھا۔

برسات شروع ہونے سے پیشتر ٹھاکر صاحب اپنی زمین اور جائیداد کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے جب بذاتِ خود اُس گاؤں میں آئے تو ان کی نظر بد کلوا کی بیوی پر جا پڑی۔ دیکھتے ہی وہ فوراً اُس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ غریب لوگ حسن اور دولت کے حقدار نہیں ہوتے۔ انہیں تو بس روٹی کے چکر ہی میں اُلجھے رہنا چاہیئے۔ چنانچہ جھٹ اوچھے ہتھکنڈوں کا استعمال شروع ہو گیا۔ یعنی رامو کو فوراً بلوایا اور اُس کی اپنی شادی پر دیئے گئے قرضے کی رقم بمعہ سود یکدم ادا کرنے کا تقاضہ کر دیا۔ غریب رامو کی جیسے جان نکل گئی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اتنے لمبے عرصہ میں پانچسو روپے کا تو سود ہی اسقدر بن گیا تھا کہ اُس جنم میں تو کیا اگلے جنم میں بھی اتنی قلیل آمدنی سے وہ ہرگز ہرگز نہیں چکا سکتا تھا...... وہ فوراً ٹھاکر صاحب کے قدموں میں گر پڑا تھا اور گڑگڑا کر کچھ مہینوں کی مہلت مانگی۔ ٹھاکر صاحب لال پیلے ہو کر واپس لوٹ گئے۔

کلوا کو جب پتہ چلا کہ ٹھاکر نے اس کے پتا کو اس قدر ذلیل کیا تو غریب تڑپ کر رہ گیا.......... وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے ہی اُس کا باپ جبراً بندھوا مزدوری کی خطرناک گہری دلدل میں پھنسا ہوا بُری طرح چھٹپٹا رہا ہے........ اور دوسرا قرضہ جو کہ کلوا کی شادی پر لیا تھا، اُس کے دل و دماغ کو پہلے ہی کھوسٹ رہا تھا۔ کلوا بے چارہ بھلا کر بھی کیا سکتا تھا۔ بس اسی اُمید پر جی رہا تھا کہ ایک نہ ایک دن بھگوان اُن کے ساتھ ضرور انصاف کرے گا۔ لیکن اُس روز اپنے والد کے تئیں ٹھاکر کا ناقابل برداشت وطیرہ دیکھ کر کلوا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی...... آنسوؤں کے لرزتے ہوئے قطروں کا ترانہ سن کر یہ زمین و آسمان بھی جھنجھلانے لگے اور اسی رات موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

وہ برسات کی رات نہایت بھیانک تھی جیسے بیوہ کا مستقبل، آکاش میں ہلچل تھی، ہاہاکار تھا، ایک طوفان تھا اور چاروں طرف سنسان تھا۔ یوں لگتا تھا

جیسے یہ دھرتی تڑپتی، مچلتی جھنجلا رہی ہو...... رات روتی ہوئی دم توڑ گئی مگر کالے کلوٹے بادل آسمان پر بدستور جمے ہوئے تھے۔ پانی لگاتار پڑ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں کبھی کبھار بارش کم ہو جاتی اور پھر زور سے مینہہ برسنے لگتا...... بند ہونے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

پچھلے تیس گھنٹوں سے چھاجوں پانی پڑ رہا تھا۔ اس زور سے بارش ہونے کی وجہ سے زبردست سیلاب آ گیا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا... پانی جو زندگی کے لئے اشد ضروری ہے، آج تباہی کرنے پر آمادہ ہے، آس پاس کے علاقے میں اس پانی نے قیامت برپا کر دی تھی...... ان گنت گاؤں اُجڑ گئے۔ ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ کتنے ہی لوگوں کی جانیں تلف ہو گئیں۔ لاتعداد مویشی مر گئے، فصلیں تباہ ہو گئیں اور کیا نہیں ہوا......؟

پانی بدستور پڑ رہا تھا۔ دریائے جمنا اور گومتی میں طغیانی آ جانے کی وجہ سے بندھ ٹوٹ گئے۔ باڑھ کا پانی آس پاس کے شہروں، گلی کوچوں میں کہرام مچا رہا تھا۔ چرند پرند دانہ دُنکا چگنے کے لئے ترس رہے تھے۔ دہاڑی دار مزدور اور رکشا چالک بے بسی کی حالت میں آسمان کی طرف دیکھتے، بڑبڑاتے اور زمین پر تھوک دیتے...... بھگوان کا انصاف بھی نرالا ہے۔ دیش میں کہیں تو سوکھے سے پریشان ہیں اور کہیں بارش سے بربادی...... یعنی کہ ۔

ایک ہی سورج کے دو سائے، صبح کہیں اور شام کہیں

علی پور گاؤں پوری طرح پانی سے گھر چکا تھا۔ گاؤں کو ملانے والی سڑک پانی میں ڈوب گئی تھی اور اس پر بنا ہوا پل ٹوٹ چکا تھا۔ لوگوں کا سامان اور مویشی پانی میں بہہ گئے تھے۔ ٹھاکر صاحب کے بھی سبھی مویشی، ٹریکٹر اور گاڑی وغیرہ لاپتہ تھے۔ ساری فصل تباہ ہو گئی اور اسی افراتفری میں اس کا ایک معتمد گھریلو نوکر زیور اور نقدی لے کر فرار ہو گیا...... گاؤں کے لوگوں نے مکان کی چھتوں اور درختوں پر چڑھ کر اپنی جانیں بچائیں...... مگر

بیچارے کلوا کا بوڑھا باپ اور اس کا دو تین سالہ بچہ جو کہ دادا رامو کے ساتھ ہی رہتا تھا، لاپتہ تھے۔ پرمیشور جانے ایسی کتنی ہی جانیں پانی کی لپیٹ میں آ چکی تھیں۔

کالے کالے بادل ابھی تک جمے ہوئے تھے، البتہ ان کا دم ضرور ٹوٹ چکا تھا، اور طوفانی ہوا ابھی سسکیاں بھرنے لگی تھی۔ گومتی ندی پر بنے پل کے دوسرے کنارے پر بہت سے لوگ جمع ہو رہے تھے، وہاں پر ایک بڑا درخت پتھر کی آڑ میں اٹک گیا تھا، اس کی بڑی بڑی شاخیں پانی کی سطح سے اوپر تھیں اور ان میں ایک آدمی کی گردن پھنسی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایک موٹی سی ٹہنی پر اس کے ہاتھ مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ سبھی کا یہ خیال تھا کہ وہ شخص دم توڑ چکا ہے مگر...... جاکو رکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی۔ جب اس کو پانی سے باہر نکال کر اس کی نبض دیکھی گئی تو آشا کی کرن نظر آئی۔ فوری میڈیکل ایڈمل جانے کی وجہ سے ادھ موا شریر مکمل طور پر حرکت کرنے لگا...... ابھی اس کی دیکھ بھال ہو ہی رہی تھی کہ دفعتاً ایک شور مچا۔ لوگوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ صرف پانی ہی پانی تھا.... اچانک دور ندی میں ڈوبتا ابھرتا ایک نقطہ سا نظر آیا جو دھیرے دھیرے نزدیک آنے پر ابھرتا چلا گیا۔ سبھی کی نظریں ہچکولے کھاتی ہوئی اس شے پر مرکوز تھیں .... ذرا غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک چھوٹی سی چارپائی پر ایک معصوم بچہ پانی کے ساتھ کھیلتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ بے رحم پانی کے جوشیلے اور پرخطر بہاؤ سے بے خبر یہ ننھی سی جان نہ جانے کتنی دیر سے طوفانی تھپیڑوں اور بارش کی بوچھاڑوں کا مقابلہ کرتی رہی...... دو تین آدمی فوراً پانی میں کود پڑے اور بچے کو نکال لائے ...... ادھر جب بوڑھے کو ہوش آیا تو وہ میرا للوا... میرا للوا..... کہہ کر چیخ پڑا......... اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ دوبارہ ہوش آنے پر اس کو سیلاب زدگان کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا جہاں اس کے پریوار کے سبھی افراد

یکے بعد دیگرے مل گئے.... کتنا سندر ملن تھا اور کتنا پیارا وانوکھا تھا یہ ملاپ۔ ......! کیمپ میں رہتے ہوئے سینکڑوں مرد، عورتوں نے حیرانی سے یہ خبر سنی کہ ٹھاکر راج سنگھ کی ۱۹ سالہ لڑکی ارپنا گومتی میں ڈوب گئی ہے۔ کیسے یہ کسی کو پتہ نہ تھا۔ سیلاب اُترنے کے کچھ دن بعد جب لڑکی کی لاش ملی تو پوسٹ مارٹم کے بعد ڈاکٹروں نے رپورٹ دی کہ لڑکی پانچ ماہ کی حاملہ تھی.... اب لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ ارپنا نے آتم ہتیا کرنے کے لئے خود ہی اپنی جان گومتی کی لہروں کے حوالے کر دی۔ کسی اور کو احساس ہو یا نہ ہو مگر کلو ائی بیوی کے دل میں رہ رہ کر یہ بات آرہی تھی کہ.... وہ مجھے روپوں کی جھنکار سنا کر پھنسانے کے لئے سرگرم ٹھاکر رام سنگھ کے دل کی نفسانی آگ کو گومتی کی لہروں نے ضرور ٹھنڈا کر دیا۔"

عورت ایک روپ انیک

حسبِ معمول وہ اس روز بھی اپنی چھت پر آئی، ہاتھوں میں گیلے کپڑے تھے اور زلفیں الجھی ہوئی۔ چھت کی منڈیر پر کپڑے پھیلا کر اس نے اپنی لٹوں کو جھٹکا دیا اور ایک طرف بیٹھ گئی۔ ہوائے شوخ، بے باک جھونکے اس کے بالوں کو پریشان کر رہے تھے۔ اس نے بالوں کو ٹھیک کرتے ہوتے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، دیکھا کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اور جب اُسے کوئی نظر نہ آیا تو وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگی اور پھر آہستہ آہستہ دھیمے سریلے سر ہوائی لہروں کا سہارا لیکر منوہر کے مکان کی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ منوہر اپنی کھڑکی سے سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا۔ البتہ گانے والی کو اس کی خبر نہ ہوتی تھی۔

اس کا نام چھایا تھا۔ جب وہ گانے لگتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے بند پنجرے میں کوئل بول رہی ہے اور اس کی ہوک جنگل سے لوٹ آتی ہو، جیسے اس آواز کو سننے والا وہاں کوئی نہ ہو، گاتے گاتے اس کے معصوم چہرے پر ایک عجیب اندوہ ملال طاری ہو جاتا اور اس کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں، جیسے اس کے دل کی نیم شگفتہ کلی پوری طرح کھلنے سے پیشتر ہی کسی حادثے میں پامال ہو کر رہ گئی ہو۔ نہ معلوم اس کے تصور میں کتنی مایوس تمنائیں اور ناکام آرزوئیں تڑپ رہی تھیں اور سسک سسک کر دم توڑ رہی تھیں، اس کو چھایا کے سوا اور کون جان سکتا تھا.....؟

اس طرح وہ ایک روز چھت پر آئی اور کپڑے ڈالکر گنگنانے لگی۔ ہوا کے شریر جھونکے اس روز بھی اپنی شرارتوں سے باز نہیں آرہے تھے۔ منوہر اپنی کھڑکی کی اوٹ میں کھڑا اشتیاق آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا......اور وہ گا رہی تھی....لٹ

الجھی سلجھا جارے بالم .... گاتے گاتے اس کا گلا بھر آیا، اور آنکھیں اشک آلودہ ہو گئیں. منوہر بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا. وہ سوچنے لگا...... ہوا کے شوخ اور بے باک جھونکوں نے اس کے بالوں کو الجھا تو ضرور دیا ہے لیکن اس کے گورے گورے ہاتھوں میں مہندی تو نہیں لگی ہے، اگر وہ چاہے تو اپنے ہی ہاتھوں سے بکھری ہوئی لٹوں کو سنوار سکتی ہے. لیکن وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی لٹیں سلجھانا نہیں چاہتی. اس کی یہ خواہش ہے کہ کوئی ساتھی آئے اور بڑے پیار سے ان لٹوں کو سنوار دے اور اس کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر سہلاتا رہے ...... اور پھر منوہر سوچنے لگا .... آخر یہ ایسے پرسوز اور دلگداز گیت کیوں گایا کرتی ہے ... ؟ اس کے ننھے منے دل میں کیسا درد ہے ؟ کیسا سوز و اضطراب ہے، آخر اسے کون سا رنج اور صدمہ ہے ..... ؟؟

چھایا کو ایسے پرسوز گیت گاتے سن کر منوہر کا دل مجروح ہو جاتا ہے. کئی بار اس نے چاہا بھی کہ چھایا سے پوچھ لے .... تم ایسے گیت کیوں گاتی ہو اور کیوں روتی ہو ؟ لیکن اس کی زبان سے ایک بھی لفظ نہیں نکلا...... بھلا اس کا چھایا سے کیا واسطہ ؟ آخر اُسے کیا مطلب ؟ کیا یہ کم اخلاقی گراوٹ ہے کہ وہ چھپ کر اپنی کھڑکی سے ایک نوجوان پرائی لڑکی کو تکتا ہے.......... اور اور اب چلا ہے اس کے گانے اور رونے کا سبب پوچھنے ..... اگر چھایا کی پرنم آنکھوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پانی آ جاتا ہے تو اس میں بیچاری چھایا کا کیا قصور ہے ؟

چنانچہ کچھ ایسی ویسی باتیں سوچ سمجھکر اور دلکو گالی جھڑکی دے کر منوہر اپنے دل کو مناتا رہا..... ؟ البتہ کبھی کبھی چھایا کے ساتھ رونے میں وہ لذت ضرور محسوس کرنے لگتا.

چھایا کے ساس اور سسر اگرچہ کافی مدت سے منوہر کے پڑوس میں رہ رہے تھے لیکن منوہر نے ایک بار بھی ان کے مکان میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا. چھایا کی

ساس تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن منوہر کی ماں کے پاس آنی جاتی تھی.... چنانچہ ایک دن منوہر کو چھایا کی حالت کا پتہ چل ہی گیا....... منوہر کی ماں نے بتایا کہ چھایا بیوہ ہے......... سنتے ہی منوہر کا کلیجہ دھک سے ہو گیا...... اُف یہ عمر اور بیوگی......... پھر بھلا اس کے گیت میں درد اور راگ میں سوز نہ ہو تو کیا ہو......؟ اور وہ چپکے چپکے آنسو نہ بہائے تو دل کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھا دے کیسے، اور پھر بھلا کون جانے کہ گانے اور آنسو بہانے سے اس نوجوان بیوہ کے دل کی آگ کم ہوتی ہے یا اندر ہی اندر بھڑکتی ہے.....؟

منوہر کا دل چھایا کے لئے ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔ کئی بار اس کا جی چاہا بھی کہ کسی نہ کسی بہانے سے چھایا کے گھر جا کر بات چیت کرے، اسے جتا دے کہ جب وہ روتی ہے تو دراصل وہ تنہا نہیں روتی، بلکہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی چپکے چپکے روتا ہے، آنسو بہاتا ہے...... لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اگر اس کی ساس نے بُرا مانا تو.........؟ اور اگر کہیں چھایا ہی خود پوچھ بیٹھی کہ...... کسی اور کو مجھ سے کیا واسطہ۔ ؟ کیوں آنسو بہاتا ہے میرے ساتھ کوئی...... تو کیا جواب دیگا....... بس یہی سوچ کر وہ ہر مرتبہ رہ جاتا

جب وہ چھایا کو گلی یا بازار میں دیکھتا تو اس کی طرف کچھ ایسا زیادہ کھنچاؤ محسوس نہ کرتا۔ لیکن جب وہ اُسے اپنی کھڑکی سے دیکھتا...... ہوا کے شریر جھونکے اس کی لٹوں سے کھیلتے، اور وہ انگڑائیاں لیکر کچھ گاتی تو اس کے حسن کا، شباب کا، اس کے گانے کا.... اور گانے کے سوز گداز کا منوہر پر ایک انوکھا اثر ہوتا۔ وہ مسحور ہو جاتا اور چھایا کے ساتھ بات چیت کرنے اور ہمدردی جتانے کی وہی پُرانی آرزو شدت سے پھر پیدا ہو جاتی مگر تڑپ کر رہ جاتی...... اور نتیجہ یہ ہوا کہ منوہر بھی مغموم سا رہنے لگا۔ اس کا دل کسی کام میں نہ لگتا۔ پڑھنے بیٹھتا تو پڑھا نہ جاتا، کھیلنے جاتا تو وہاں بھی اس کا دل باغی ہو جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس دنیا سے کہیں دور بھاگ جائے...... چنانچہ جب ہولی کا تہوار

آیا تو وہ یار دوستوں کی ٹولی میں شامل نہ ہوا۔ اُوپر اپنے کمرے میں ہی کھڑکی کے سہارے بیٹھا چھایا کے بارے میں سوچتا رہا۔

باہر گلی میں ہر کوئی ہولی کا نعرہ لگا رہا تھا۔ لوگوں کی پوشاکیں تر تھیں اِک رنگ میں کوئی مستی میں ناچتا مٹکتا، تو کوئی گیت گاتا اور کوئی گلے میں جوتیوں کا ہار ڈالے سب کو دیکھ رہا تھا، تو کوئی ڈھولک چمٹہ ستار بجا رہا تھا...... لیکن منوہر اپنے خیالات کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ چھایا کے سینے میں بھڑکتی ہوئی اس آگ کو سکون میں بدلنے کی فکر میں تھا۔ جیسے چھایا گنگنا کر، گا کر اور آخر رو کر سرد کرنا چاہتی تھی وہ اس آگ کو جتنا دبانے کی کوشش کرتی تھی اتنی ہی وہ زیادہ بھڑکتی، شاید اس پر اس کا بس نہیں چلتا تھا......!

باہر گلی میں بچوں کا جھگڑا سا ہو رہا تھا۔ اور اِدھر منوہر کے دماغ میں خیالات کا فساد ہو رہا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ چھایا کو ایک خط ضرور لکھنا چاہئے۔ تاکہ اس بے چاری کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ وہ اس کا شریکِ غم ہے اور اُسے اس سے انتہائی ہمدردی ہے لیکن مشکل یہ در پیش تھی کہ خط اس تک پہنچایا کیسے جائے۔ اور پھر خیال آتا کہ چھایا کہیں برا تو نہیں مان جائیگی۔ آخر حوصلہ کر کے منوہر نے ایک خط تحریر کر دیا

چھایا.........!

پچھلے دِنوں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت اداس رہتی ہو۔ تمہاری حالت دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تمہارے سینے میں ایک دبی ہوئی چنگاری ہے جو سلگ رہی ہے جس کا دھواں نظر نہیں آتا۔ اندر ہی اندر گھن پیدا کر رہا ہے ایسا لگتا ہے کہ کوئی گہری چوٹ دل کا ناسور بن کر رہ گئی ہے اور جب کبھی دم توڑتی ہوئی آشاؤں کا جوار بھاٹا بے قابو ہو جاتا ہے تمہارے دل میں، تو آنکھوں کے انمول موتی یہ رازِ دل لے کر گالوں پر ڈھلک پڑتے ہیں۔ بے کسی کی انتہا دیکھتے ہوتے ارمانوں کو دیکھ کر کئی بار دل نے چاہا کہ تم سے یہ راز پوچھوں، مگر ہمت نہ کر سکا۔ پاس ہوتے ہوتے بھی کتنا دور اور مجبور ہوں۔ تمہیں خط لکھنے کی کئی بار کوشش کی

مگر تم تک پہنچانے میں ناکامیاب رہنے کی وجہ سے لاچار رہا۔ تمہاری یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ اسی لئے آج یہ خط لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں۔ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ وہ لکھ نہیں سکتا، اور جو کچھ لکھ سکتا ہوں وہ لکھا نہیں جا رہا۔ میری ہمیشہ یہ جاننے کی خواہش رہی ہے کہ آخر وہ کونسا صدمہ ہے ...... کیا درد ہے جس کا بوجھ تم اپنے معصوم دل میں ہی چھپائے ہو تمہیں روتے دیکھ کر مجھے ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ میں ایک ایسے بھیانک سنسار میں رہ رہا ہوں جہاں نراشاؤں کے انبار لگے ہیں بے کسی دم توڑتی ہے ہمدردی آنسوؤں کی گود میں پنپنے دیکھتی ہے اور جہاں راہی تاروں کے پیالوں میں اپنے آنسو بھر بھر کر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں ..... چھایا مجھے پوری آشا ہے کہ تم مجھے غلط نہیں سمجھو گی اور کسی وقت جب بھی ٹھیک سمجھو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرو گی .... تمہارا شبھ چنتک

خط مکمل ہو چکا تھا۔ مگر اس کو چھایا کے ہاتھوں تک پہنچانے کی مشکل درپیش تھی۔ منوہر کے من میں ڈر تھا کہ کہیں کسی دوسرے کے ہاتھ یہ خط نہ لگ جائے۔ لہذا بڑی احتیاط کے ساتھ اِدھر اُدھر جھانکتا ہوا چھایا کے گھر کی طرف لپکا .... گلی میں ہولی کھیلنے والے بچوں کا کافی شور تھا دروازے پر پہنچ کر منوہر نے چھایا کے ساس سسر کی گھر میں موجودگی کا پتہ لگانے کی کوشش کی ... . ایک بار زور سے پکارا بھی .... چاچا جی ! آج باہر نہیں آؤ گے کیا ......؟ مگر کچھ جواب نہ ملا۔ چھایا اپنے کام میں مشغول تھی۔ ایک آدھ بار کام کی وجہ سے وہ صحن میں نکلی ضرور مگر اپنے خیالات میں ہی ڈوبی ہوئی تھی۔ دوسری بار منوہر نے چاچی کہہ کر آواز دی ...... فوراً ہی کسی نے چھایا کو آواز دی اور باہر جاکر دیکھنے کی تاکید کی۔ دوسرے ہی لمحہ چھایا کا مرجھایا ہوا چہرہ نظر آیا۔ منوہر کو دیکھتے ہی شرم و حیا کے کچھ ملے جلے تاثرات اس کے چہرے پر اُبھر آئے باہر کے کمرے کی طرف دو قدم بڑھ کر وہ رک گئی جیسے کہ قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ہو .... منوہر نے موقعہ غنیمت جان کر وہ خط چھایا کے ہاتھ میں تھما دیا ..... خط

پکڑاتے وقت اس کا ہاتھ چھایا کے ہاتھ سے چھو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے چھایا پھولوں کی بیل کی طرح کانپ رہی ہو۔ منوہر یہ کہتے ہوئے کہ لالہ جی سے کچھ کام تھا...... جلدی سے باہر گلی میں چلا گیا اور ہولی کھیلنے والوں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ انہوں نے اس کے سب کپڑے تر کر دیئے مگر اس کے دل کی جلن ابھی تک بدستور بڑھتی جا رہی تھی۔

اس واقعہ کے چار روز تک چھایا نہ تو اپنی چھت پر کپڑے سکھانے آئی اور نہ ہی باہر گلی میں نکلی۔ منوہر نے سوچا کہ شائد اس کا گھر جانا چھایا کو ناگوار گذرا ہو اسی لئے اس نے چھت پر آنا اور باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی چھایا کو دیکھنے کی تمنا منوہر کے دل میں جڑ پکڑتی گئی۔ اگرچہ ہر روز اسے مایوس ہونا پڑتا، مگر پھر بھی اپنی آرزو کی وجہ سے مجبور ہو کر وہ اس کی راہ دیکھتا رہتا کہ شائد چھایا کسی وقت نمودار ہو جائے .... اور پھر ایک روز چھایا اپنی چھت پر نظر آ ہی گئی۔ دو چار گیلے کپڑے اس کے ہاتھوں میں تھے۔ یکایک اس نے منوہر کی طرف دیکھ کر نظریں دوسری طرف پھیر لیں اور کپڑے پھیلا کر جب وہ واپس ہونے لگی تو اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس رات منوہر کو نیند نہیں آئی۔ دل و دماغ میں فساد ہوتا رہا۔ صبح چار بجے کے قریب اس کی آنکھ لگ گئی۔ منوہر نے سپنا دیکھا کہ چھایا ایک رکشا میں بیٹھی کہیں جا رہی ہے ...... وہ کہاں اور کیوں جا رہی ہے اس کا پتہ نہ چل سکا...... ہاں البتہ اس کے دل میں ایک زبردست ہلچل ضرور مچی ہوئی تھی .... یکایک منوہر کا سپنا ٹوٹ گیا کیونکہ اس کی آنکھ کھل گئی ...... سورج کافی چڑھ چکا تھا۔ لیکن وہ بستر پر لیٹا خیالات کے سمندر میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ کہ دفعتاً اس نے سُنا کہ کوئی عورت اس کی ماں کے ساتھ باتیں کر رہی تھی...... وہ کہہ رہی تھی ــــ اری بہن کیا کہوں، اس چڑیل نے آتے ہی تو میرے لال کو چٹ کیا اور اب یہاں آکر اس موئی نے اپنے یار بھی بنا لیے، جن کی اب چھٹیاں بھی آنے

جانی شروع ہوگئیں۔۔۔۔۔۔''

منوہر نے اس عورت کی آواز پہچان لی۔۔۔۔۔۔۔۔وہ چھایا کی ساس ہی تھی۔ منوہر نے چپ سی سادھ لی۔ اس کی ماں نے متفکرانہ انداز میں کہا۔۔۔۔۔۔۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو بہن تم ۔۔؟''

'' جھوٹ تھوڑے ہی کہہ رہی ہوں۔ یقین نہیں آتا تو اس کے یار کی چھٹی لاکر تمہیں بھی دکھاتی ہوں، تب تو وشواس کروگی۔۔۔۔۔۔۔؟ یہ کہہ کر وہ فوراً باہر نکل گئی اور چند منٹ کے بعد آکر بولی ــــــ ''لو یہ دیکھ لو۔ اس کے یار نے کیا لکھا۔۔۔۔۔۔۔ لو میں سناتی ہوں ــ'' چھایا کی ساس کو معلوم نہ تھا کہ منوہر اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے اور شائد اس کی ماں کو بھی منوہر کی موجودگی کی خبر نہ تھی۔ چنانچہ چھایا کی ساس نے وہ خط سارا پڑھکر سنایا۔۔۔۔۔ خط وہی تھا منوہر والا۔۔۔۔۔۔۔ منوہر کا سر چکرانے لگا۔ اس نے اپنا کلیجہ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کو ایسا لگا جیسے سارا جہاں جل رہا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔! اُف میرا خط چھایا کے گھر والوں کے ہاتھ لگ گیا جس کی وجہ سے اس غریب پر اتنی بڑی مصیبت نازل ہوگئی۔۔۔۔۔۔!

'' خط لکھنے والے کا نام کیا ہے ــ؟'' منوہر کی ماں نے دریافت کیا۔

'' اپنا نام تو لکھا ہی نہیں کمبخت نے۔''

منوہر کے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ اس کے خط ہی کی وجہ سے بے چاری بد اخلاق کہلائی، حالانکہ وہ بالکل بے قصور ہے اور اس کا اخلاق بے داغ! جب چھایا کی ساس چلی گئی تو منوہر کی ماں اندر آئی اس نے دیکھا منوہر اندر ہے اس نے منوہر سے کہا ــــــ چھایا کی ساس آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا چال چلن اچھا نہیں ہے۔ منوہر کے سینے میں جیسے تیز نشتر گھونپ دیے ہوں۔ بمزیب چھایا کی زندگی خراب ہوگئی اور منوہر اس کی صفائی میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

ماں یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ ــــ "میری بہو اگر ایسی ہوتی تو زہر دے کر ختم کر دیتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" منوہر سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ کپڑے میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

اس واقعہ کو کئی سال گذر گئے۔ منوہر چھایا کو کچھ بھول سا گیا۔ لیکن جب ہولی آئی تو نہ معلوم کیوں غمگین سا ہو جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ جیون کے سفر میں راہی ملتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی یادیں دے جاتے ہیں۔ بس یہی یادیں جیون کی سمپتی بن کر رہ جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دوسرے کے لیے۔

ایک بار منوہر کو اپنے رشتہ دار لڑکے کی شادی میں لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا رشتہ دار چونکہ لکھنؤ کا ہی رہنے والا تھا، لہذا لکھنوی نوابوں جیسے ٹھاٹھ تھے۔ ناچ گانے کا خاص طور پر انتظام تھا۔ ناچنے کے لئے جو عورت آئی وہ اتنی حسین تھی جیسے خدا کی خدائی لٹ گئی ہو۔ اس کے ماتھے کا جھومر ایسے لگتا تھا جیسے انگارے پر ٹھہرا ہوا پارہ ہو۔ پہلی نظر پڑتے ہی منوہر نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنے من میں کہنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی کسی کو تو بھگوان اپنے ہاتھوں سے ہی بناتا ہے اور فرصت کے وقت بناتا ہے وہ جوں جوں اس حسینہ کی صورت پر غور کرتا تھا اسے کوئی بھولی ہوئی صورت یاد آتی جاتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر اس نے پہچان ہی لیا اُسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چھایا ہی تھی۔ منوہر کے جسم کو کاٹو تو لہو نہیں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حلق میں کیڑیاں سی کانٹنے لگیں۔ اپنا شک دور کرنے کی غرض سے اس نے اپنے رشتہ دار سے دریافت کیا ۔ ۔ ۔ ۔ "یہ کون ہے ؟"

"بازاری عورت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کون ہوتی ۔ ؟" بڑی لاپرواہی سے اس نے جواب دیا۔

"ناچ گانے میں کمال حاصل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" منوہر نے گھبراہٹ میں کہا۔

"کمال کیسا بھیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی زندگی دُکھوں کی پوٹلی ہے اور ایک تلخ حقیقت بھی!" کچھ دیر رک کر اس نے پھر کہنا شروع کیا ــــ "یہ بیچاری بچپن میں ہی یتیم ہو گئی اور جوانی میں بیوہ بن گئی۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک بے سہارا کے لئے

کوئی ٹھکانہ نہ تھا زندگی کا بوجھ اُٹھانے کی غرض سے مجبوراً اسے ایک دور کے سمبندھی کا سہارا لینا پڑا اور وہ کمینہ اسے نوکری دلوانے کا جھانسہ دے کر چاندی کے کچھ سکوں کے بدلے کسی کے حوالے کر گیا۔ ایک شریف خاندان کی بچی اور باعزت گھر کی عورت کو اس درندے نے اس ننھی سی جان کو یہاں تک پہنچا دیا...... ایک معصوم کلی کا بے رحم گلچیں کے ہاتھوں کتنا دردناک انجام...!"

"اُف کتنی بے رحم ہے یہ دنیا۔" بے ساختہ منوہر کے منہ سے نکل گیا

ناچ گانے کا پروگرام ختم ہو چکا تھا اور لوگ جا چکے تھے۔ مگر رنگ برنگے چمکتے ہوئے قمقموں میں کسی کی جھنکتی ہوئی پائل کا عکس منوہر کو ابھی تک نظر آ رہا تھا بے خودی کے عالم میں اس کے ہونٹ تھرکنے لگ گئے...... "
......!

بالا خانوں سے جھنکتی ہوئی پائل کی صدا
میرے جذبات میں طوفان نیا لاتی ہے
لوگ ان گیتوں کی تعریف کیا کرتے ہیں
مجھ کو ان گیتوں سے مغموم سی صدا آتی ہے

●●

مجھے بھی کچھ کہنا ہے

ہمارے شہر کے کالج میں پروفیسر دیپک سب سے کم عمر والے تھے. نہایت عقلمند اور خوبصورت۔ قد لمبا۔ چھریرا بدن گھنگھریالے بال اور مستانہ چال۔ سبھی سے خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ انداز گفتگو اس قدر پر کشش کہ ممبران سٹاف کے علاوہ طلبأ بھی ان کی لچھے دار باتوں میں خوانخواہ اُلجھ جانے کے لئے خواہاں ہوتے۔ طرزِ بیان اس قدر مقناطیسی کہ جب وہ انگریزی نظم کی تشریح کرنے لگتے تو سب کی نگاہیں ٹیکس کی بجائے ان کے چہرے پر مرکوز ہو جاتیں۔ اور اگر اتفاقیہ ان کی نظریں کسی کی اُونچی نگاہوں سے ٹکرا جاتیں تو کلاس روم میں مسکراہٹ کے موتی بکھر جاتے...... مطلب یہ کہ اِتنی قابلِ تعریف خوبیوں کا خالق ہونے کے باوجود شہرت کی بلندیوں پر پرواز کرنے کی بجائے ارضِ گمنامی پر ہی پُر وقار چلنے کو ترجیح دیتے۔

موسم گرما کی تعطیلات کے بعد جب کالج کھلا تو کئی جانی پہچانی صورتیں کلاس میں نظر نہ آئیں۔ اُن میں ایک موہنی بھی تھی۔ جیسا نام ویسی ہی سندرتا۔ جیسے بھگوان نے فرصت کے وقت خود اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہو۔ ہنستی تو پھول جھڑتے۔ چال ایسی دلربانہ کہ جسے دیکھ کر بہتا ہوا دریا بھی رک جائے۔ ویسے پڑھائی لکھائی میں بھی وہ بہت تیز اور سب سے آگے تھی۔ چنانچہ اس کی غیر حاضری سبھی کو اکھر رہی تھی. ...... اور پھر ایک روز یکا یک کلاس میں رونق آگئی..... مگر اس بار موہنی کے طور طریقے بالکل بدلے ہوئے تھے.... وہ رنگین تتلی کی مانند اِدھر سے اُدھر پھدکتی پھرتی۔ لباس میں چمک دمک. نظروں میں شوخی. بات چیت میں چنچلتا ... اور یہ سب کچھ تھا بھی قدرتی. کیونکہ اس کا بیاہ جو ہو گیا تھا. چند روز سسرال میں رہنے کے

بعد وہ جب واپس آئی تو نت نئی ساڑھیاں پہن کر آتی اور کالج میں اپنی سہیلیوں کو سسرال کے نئے تجربات سناتی۔ وہ بھی گہری دلچسپی سے سنتیں اور بیباکی سے کہتیں "...... موہنی تو تو سچ مچ بھاگیہ شالی ہے۔" کئی ہم جماعت لڑکیاں تو موہنی سے حسد بھی کرنے لگ گئی تھیں۔ ہنس مکھ پتی پاکر وہ خود بھی تو اپنے نصیب پر پھولی نہیں سماتی تھی...... اچانک ہی اس نے کالج آنا چھوڑ دیا اور اپنی گرہستی میں مگن ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد انعامات تقسیم کرنے کی غرض سے سالانہ تقریب کے موقع پر کالج کے ڈرامائک کلب کی طرف سے ایک ڈرامہ بعنوان "بلیدان" اسٹیج کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ ڈرامہ کے رائٹر و ڈائرکٹر پروفیسر دیپک تھے۔ پردہ اٹھنے سے پہلے پروفیسر صاحب نے سٹیج پر آکر مائیک سنبھالا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر بولے ...."وہ کونسی ماں ہے جس نے جہیز نام کی بدصورت بیٹی کو جنم دیا ہے۔ کیسی آگ ہے یہ جہیز جو بجھانے سے اور بھڑکتی ہے۔ کیسا اژدہا ہے یہ جو سینکڑوں جوان جسموں کو نگل کر بھی اپنا پیٹ نہ بھر سکا..... جہیز ایسا گھن ہے جو پورے معاشرے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جا رہا ہے۔ یہ رستا ہوا ناسور ہے جس نے پوری قوم کو درد و کرب کی اذیت ناک صورت سے دوچار کر رکھا ہے۔ ایسا پھندہ ہے یہ جہیز جس نے ہزاروں معصوم ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا ہے......" تالیوں کی گونج کے درمیان دفعتاً ڈرامہ شروع ہو گیا۔

ڈرامہ میں جہیز کی ویدی پر بلیدان ہونے والی جس بدنصیب لڑکی کا کردار پیش کیا وہ بالکل سچا لگتا ہے۔ بگڑے ہوئے سماج کی حقیقی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بیشتر والدین اپنے لڑکے کو لڑکی والوں کے ہاتھوں بیچنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ نقدی پہلے ہی وصول کر لی جاتی ہے۔ جہیز کا سامان ڈولی سے پیشتر ہی دلہا میاں کے گھر پہنچ جاتا ہے اور بعد ازاں دلہن کو صرف تین کپڑوں میں بیاہ لانے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اور پھر...... کچن میں سٹوو پھٹنے سے آگ صرف گرہ لکشمی کی ساڑھی کو ہی لپیٹ میں لیتی ہے...... ساس اور نند کے کپڑے تو شاید فائر

پروف ہوتے ہیں .....! ڈرامہ کے اختتام پر نسل نو کے سبھی فرزندانِ ارجمند کو اشارتاً مشورہ پیش نظر تھا۔ کہ وہ جہیز کی لعنت سے بالاتر ہو کر معصوم نوخیز کلیوں کو پژمردگی سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کریں۔

اگلے روز سارے کالج میں ڈرامہ کی واہ واہ ہو رہی تھی۔ سبھی کی زبان پر پروفیسر دیپک کی ذہانت، قابلیت اور صلاحیتوں کا چرچا تھا۔ پرنسپل اور سٹاف ممبر تعریف کرتے تھکتے نہ تھے۔ اپنی کلاس میں جب پروفیسر صاحب پہونچے تو سرگوشیانہ انداز میں تعریف ہوتی رہی۔ کلاس ختم ہوتے ہی لائبریری کے نزدیک لڑکیوں کا ایک جھنڈ جمع ہو گیا۔ موہنی ان کے بیچ میں تھی۔ اس کا چہرہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح پژمردہ ہو گیا تھا۔ شوخی کی جگہ سنجیدگی اُبھر آئی اور چلبلاہٹ غائب ہو چکی تھی۔ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔ بمشکل سے کسی کی ایک آدھ بات کا جواب دے پاتی۔ اور پھر سسکنے لگ جاتی..... جھرمٹ میں کھڑی سب لڑکیاں بت کی طرح خاموش سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں...... اور موہنی کی ہمراز سہیلی نرملا ہولے ہولے بتا رہی تھی کہ کس طرح موہنی کا پتی دورایک جلتے ہوئے شہر میں دنگے فساد ہونے کی وجہ سے اُگرواد یوں کی گولی کا شکار ہو گیا..... اُف یہ عمر اور سہاگ بیوگی۔ غریب پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا..... سچ کہا ہے...... کچھ سایوں میں لپٹی ہوئی دھوپ ہے یہ دنیا۔

ادھوری تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے رشتہ داروں کے اصرار پر موہنی کو کالج میں دوبارہ داخلہ دلوایا گیا۔ تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔ کالج کی فیس معاف ہو گئی اور لائبریری سے سب بکس بھی فری مل گئیں۔

وقت کا پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا اڑتا چلا گیا۔ بی۔ اے فائنل کے امتحان قریب آپہنچے، نرملا انگلش کے کچھ نوٹس لینے کے لئے موہنی کے گھر جب پہنچی تو دیکھا کہ وہ خود امتحان کی تیاری میں مصروف تھی۔ میز پر پروفیسر دیپک کے ہی تیار کئے ہوئے انگریزی کے نوٹس پڑے ہوتے تھے۔ موہنی کے گالوں کو دھیرے سے تھپ تھپاتی ہوئی بولی

.......اری میری چینی کی گڑیا! یہ مہمان وکیتی۔ تجھ پر کب سے دیالو ہو گئے...؟ کیا سچ مچ اُن کے دل پر چھاپ لگا دی تونے....؟" جواباً موہنی دھیرے سے مسکرا دی اور سہج سہج کہنے لگی... "نمو! میں کئی دنوں سے تمہیں صاف طور پر بتانا چاہتی تھی کہ پروفیسر دیپک مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہیں مگر....؟؟"

"یہ اگر مگر کیسی —؟" نرملا نے اشتیاق آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"ارے پگلی، وہ ذات کے کمہار ہیں اور ہم اگروال۔ اوّل تو میرے پتاجی ہی نہیں مانیں گے اور اگر کسی طرح راضی بھی ہو گئے تو سارے رشتے دار طعنوں ہی طعنوں میں ہمیں کھا جائینگے۔ اور برادری والے الگ اڑچن ڈالیں گے..... مصیبت میں جان پھنس گئی......؟"

"تو پھر تمہاری اگروال برادری سے ہی کوئی سورما تیار کیوں نہیں ہوتا...؟"

"بھلا کیسے تیار ہو...... میں ودھوا جو ہوں۔ اور پھر دان دہیز کہاں سے ہو گا۔ پتاجی تو پہلے ہی بھاری قرضے تلے دبے ہوتے ہیں۔ ہماری برادری میں تو نقد مال خوب چلتا ہے.........!"

"میری اچھی مونو! تبھی تو کہتی ہوں کہ آجکل بنا دان دہیز مے کیا کوئی کنوارہ لڑکا بیاہ کے لئے تیار ہو گا..... چھوٹی موٹی نوکری ملتے ہی آجکل کے چھوکروں کے دماغ ساتویں آسمان پر ٹہلنے لگتے ہیں۔ نوکری والی لڑکی مانگتے ہیں... اور سکوٹر اور فرج کے خواب دیکھتے ہیں........ پروفیسر صاحب کا یہ تیاگ کیا معمولی ہے......؟ اپنے پتاجی کو کسی طرح راضی کر لے۔ رشتے داروں کی کوئی پرواہ نہ کر اور سماج کے ٹھیکیداروں کو کہہ دے..... ٹاٹا.....!"

آخر موہنی کے پتاجی راضی ہو ہی گئے۔ اور یہ شادی طے ہو گئی۔ دو چار دن تک تو گلی پڑوس میں اس بات کو خوب اُچھالا گیا۔ نزدیکی رشتہ داروں نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور شادی میں شامل نہ ہونے کی دھمکی بھی دی..... القصہ اس قدر مخالفت ہونے کے باوجود...... آخر آ ہی گیا وہ دن بھی اک دن....نہ

باجہ گاجا۔ نہ ہاتھی گھوڑا اور نہ ہی دھوم دھماکہ۔ نہ ہی کوئی رتھ پالکی.... صرف ایک ٹیاڈور میں سات آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ پروفیسر دیپک شادی والے پنڈال کے قریب جا پہنچے..... اڑوس پڑوس و برادری کے چند لوگ جو پہلے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اُن لوگوں کو دیکھ رہے تھے.... فوراً اِدھر اُدھر ہو گئے۔ دلہا کے سواگت کے لئے برادری والا کوئی نہ تھا..... چنانچہ موقعہ کی نزاکت دیکھتے ہوئے پروفیسر صاحب خود ہی گاڑی سے اتر آئے اور جھک کر گپتا جی کے پاؤں چھو لئے۔ آس پاس کھڑی ہوئی عورتیں یہ انوکھا نظارہ دیکھ کر دنگ رہ گئیں کہ دلہا کتنا سندر اور عقلمند ہے۔ ایک منہ پھٹ عورت نے تو آہستہ سے کہہ ہی دیا....." اس وِدھوا کے بھاگیہ میں ایسا سندر، ہنس مکھ بنّا (دلہا)!"

جے مالا کی رسم کے بعد شبھ لگن میں شادی مکمل ہو گئی۔ موہنی کے پتا گپتا جی سے ایسا نیک دل اور خوبصورت داماد پا کر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ براتیوں کے لئے کھانا نہایت سلیقہ سے میزوں پر سجا دیا گیا۔ دلہا دلہن ایک میز پر تھے۔ جونہی پروفیسر صاحب نے کھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ایک کھردری آواز نے ٹوک دیا۔ .... ناٹے قد کی ایک ادھیڑ عمر مریل سی عورت ہاتھ جوڑے لجاجت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی ...." ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ شادی میں کھانا کھانے سے پہلے داماد بہت قیمتی چیز کی مانگ کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے دلدار امیر باپ کا بیٹا ہے........!"

گپتا صاحب تلملا کر رہ گئے۔ کمبخت نہ جانے کہاں سے آ ٹپکی۔ بے عزتی کروانے پر تلی ہے۔ ......ان کے دل میں کچھ دیر پہلے خوشی کی جو لہر اُٹھ رہی تھی، بالکل مدھم پڑ گئی...... سوچنے لگے........ پروفیسر صاحب نہ معلوم کیا مانگ لیں...... اور پھر کہاں سے انتظام ہو سکے گا — ؟

اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے لوگ اس نازک موقعہ پر پنڈال کے عین نزدیک اکٹھے ہو گئے اور کانا پھوسی ہونے لگی۔ ماحول عجیب سا بن گیا تھا۔ پروفیسر صاحب

تذبذب میں پڑ گئے ...... مگر فوراً ہی ان شرارتی لوگوں کا مدعا بھانپ گئے اور کھڑے ہو کر مؤدبانہ انداز میں بولے ......" مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔ کیا آپ لوگ شانتی پوروک سننے کا کشٹ کریں گے ......" جھٹ خاموشی چھا گئی۔ مسکان بکھراتے ہوئے وہ کہنے لگے ـــ" بن مانگے موتی ملے مانگی ملے نہ بھیک ..... سب سے قیمتی جو چیز تھی وہ تو پہلے ہی مجھے مل چکی ہے۔ اب اس گھر میں مانگنے والی دوسری قیمتی چیز رہ ہی کیا گئی ہے ...." اور پھر اپنے ساتھیوں کو کھانے کا اشارہ کرتے ہوئے جھٹ کھانا کھانے لگ گئے ...... پنڈال میں "بلّے بلّے" کی تان پر خوشی جھومنے لگی۔ گپتا جی کا چہرہ دمک اٹھا اور موہنی کنول کے پھول کی مانند کھِل گئی ...... مگر چند شرارتی لوگوں کے چہرے ضرور اُتر گئے۔ عین اُسی وقت پرنسپل آہوجہ نے آکر پروفیسر دیپک کو آشیرواد دیتے ہوئے زیرِ لب مسکرا کر کہا .... قسمت کو جو بدل کر چلے دانا وہی ہے اور جنت کا سفینہ بھی اس کے لئے ہیچ ہے ...." دفعتاً موہنی کا چہرہ اور بھی نورانی ہو گیا۔ وہ معصوم اداؤں کا سہارا لیکر لیجاتی ہوئی اُٹھی اور گلابی جوڑے میں اپنے پتا کی غریبی کو چھپائے اندر چلی گئی!

●●

کھوٹا سِکّہ

جُون کا مہینہ اور دوپہر کا وقت .... جُھلسا دینے والی لُو اور تپتی دُھوپ میں تارکول سے تپتی ہوئی کالی سڑک انگارے اُگل رہی تھی .... اور ایسے میں بے کس غریب دھنو پتھر ڈھو رہی تھی۔ گود میں اس کا معصوم بچّہ بھوک کے مارے بلک رہا تھا۔ وہ بے چارا ماں کے دودھ کے بدلے آنسو پی کر کبھو کا ہی سو گیا تھوڑی دیر کے لئے۔ غریب ماں نے دھرتی بچھا کر آکاش اوڑھا کر اُسے سُلا دیا تھا۔

ماں بھلا اس ننھی جان کو اپنا دودھ کہاں سے پلاتی، وہ تو خود بھوکی تھی جانور بھی پیٹ بھر کھانے کے بعد ہی دودھ دے پاتے ہیں ....!

اُف! اس دھرتی پر زندگی کھنڈرات سی ہے۔ بستی ہے ہر کھنڈر کہانی اُگلتا ہے۔ ہر انسان کے اندر کی کہانی .... دُکھ درد، غریبی اور بھوک کی داستاں ....!

پتھر ڈھونے والی اُس دُکھیاری ماں کا سوکھا چہرہ اور بکھری ہوئی زلفیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ دورِ خزاں سے پامال ایک بے سہارا جان ہے۔ اُس کا خاوند کالو بس اسٹینڈ پر مزدوری کرتا تھا۔

ایک رات دیر سے آنے والی بس پر چند جنونیوں نے گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ غریب کالو، وقت کا ستایا بس یونہی پھنس گیا تھا وہاں پر .... دفعتاً ایک دندناتی ہوئی گولی اس معصوم کے سینہ کے پار ہو گئی: اور

وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لاش کی شناخت جلد نہ ہو سکی..............!

اور جب دھنو کو معلوم ہوا کہ اُس کا سنسار اُجڑ گیا تو وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ بہت تڑپی تھی وہ بے چاری............ زمین پر سر مار مار کر اپنا بُرا حال کر لیا تھا اُس نے۔ اور لوگ جب ارتھی تیار کرنے لگے تو جنونی انداز میں چیختے اور سینہ پیٹتے ہوتے دھنو اپنے بال نوچنے لگی۔ کپڑے تار تار کرنے لگی......... وہ روتی پیٹتی، گرتی پڑتی کافی دُور تک ارتھی کے پیچھے پیچھے بھاگی تھی۔ آس پاس کی جھگی والیوں نے اُسے بہت روکا، دلاسہ دیا۔ مگر دُکھیاری کے دل کو صبر کہاں۔؟ اُس وقت اُس کا بچہ چند دنوں کا ہی تھا۔ جسم لاغر ہونے کی وجہ سے وہ کپکپاتی ہوئی نڈھال ہو کر گر پڑی تھی۔

اب بے چاری دھنو بیوہ ہو گئی تھی.......... اُف! یہ عُمر اور بیوگی ظالم وقت کسی کا بھی ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ کسی کی حالتِ زار پر معمولی سا بھی ترس نہیں کھاتا........... غریب دھنو وقت کی چکی میں پستی رہی، اور اُس کا بچہ بھوک وافلاس کے پنگوڑے میں پلتا رہا.........!

دھنو جیسے ہر قسم کا دُکھ پروف ہو گئی تھی۔ ہر غم اُس پر کوئی اثر چھوڑے بغیر گذرنے لگا تھا۔ اور وہ زندگی گذارنے لگی آدھی جی کر، آدھا کھا کر۔ آدھا جاگ کر اور آدھا سو کر.......... جانے کیسے یہ آپی آپ ہونے لگا تھا۔

خُدا کی دی ہوئی یہ اُدھار کی زندگی صبر و شُکر کے ساتھ آخر گذارنا تو ہے ہی.......... چاہے رو کر گذارو یا مسکرا کر.......... ہاں البتہ، دل کی آگ میں ایک ایسی آگ بھی ہوتی ہے جو آنسوؤں سے ہی بُجھتی ہے، درد ہلکا ہوتا ہے۔

داڑھی مونچھ کی سیاہی اُبھرنے تک معصوم راجو گندے نالے کے پل کے نیچے ہی پل کر بڑا ہوا۔ آتے جاتے لوگوں کے جھوٹے ٹکڑوں پر....... کبھی بس اسٹینڈ پر پڑی ادھ کھائی جھوٹن کو کھا کر.......!

لیکن اب بعض لوگوں کی بے وجہ جھڑکیوں اور دھتکار سے اُس کے ننھے

دل میں اُتھل پتھل ہونے لگی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں غصّے کی تیکھی لالی روز بروز بڑھنے لگی تھی۔ مگر اس کا ضمیر چُپ چاپ سا دھے پڑا رہتا.........!

اُس کی ایک ادھ ننگی فوٹو ایک انگریز ٹورسٹ عورت کھینچ کرلے گئی تھی یہ اُس کو آج تک یاد تھا، چند اُلٹی سلٹی یادوں کے ساتھ.........!

اور نزدیک کی کالونی میں رہنے والے خوش پوش چہکتے بچوں کو دیکھ کر اُس کا نادان دل بغاوت کرنے پر آمادہ ہونے لگتا.......   یا پھر کسی کار والی دیسی میم بے پرس کو دیکھ کر اُس کے ہاتھوں کی مُٹھیاں بھنچ جاتیں۔ اور وہ اپنی آنکھیں مُوند کر کچھ سوچنے لگ جاتا.........؟

ایک روز شام کے وقت وہ غبارے بیچنے والے لڑکے سے اُلجھ پڑا تھا۔ جھگڑا بڑھتا گیا نوبت ہاتھا پائی تک پہونچ جاتی اگر اُس کی ماں دھنّو اتفاقیہ اُدھر سے نہ گذر رہی ہوتی۔

ماں کی آنکھوں میں پیار دُلار چمکتا دیکھ کر راجو نے گول گپّے کھانے کے لئے پیسے مانگے۔ دھنّو نے اپنی دھوتی کے پلّو میں بندھا ہوا روپے کا سکّہ اس کو سنبھال دیا تھا۔ راجو خوشی سے اُچھل پڑا اور فوراً چاٹ والے کی ریڑھی کی طرف دوڑ گیا۔ روپے کا سکّہ چاٹ والے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے نہایت نرمی سے بولا—"بھیّا! ان پیسوں کے گول گپّے دے دو۔!!

چاٹ والے نے روپے کا سِکّہ اُلٹ پلٹ کر بغور دیکھا، اور دوسرے لمحہ اُس سکے کو پرے زمین پر پھینکتے ہوئے تڑک کر بولا—"چل بے! یہ کھوٹا سکّہ ہے۔ اس کا کچھ نہیں ملے گا......!"

بھولا بھالا راجو اُس چاٹ والے کے چہرے کی طرف بے بس نگاہوں سے تکنے لگا، اور سوچنے لگا......"کیا سچ مچ یہ سکّہ کھوٹا ہے یا وہ شخص جس نے میری ماں کو جان بوجھ کر دھوکے میں یہ دیا ہے.........؟"

اور پھر عین اسی وقت اُس کی ننھی مُنّی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل

کر گالوں پر سے لڑھکتے ہوتے زمین پر گر کر اپنی شناخت کھو چکے تھے. کیونکہ یہ دھرتی تو ایسے ان گِنت آنسوؤں سے پہلے ہی بھیگی ہوئی ہے.

●●

پیٹ کی خاطر

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب بھارت میں فرنگیوں کا راج تھا اور دوسری عالمگیر جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اِسی دَوران دوردیش میں ڈگڈگی باجی...... بھوکا ہے بنگال بابا ......! اشیاءِ خوردنی کے بھرپور سٹاک ہونے کے باوجود قحط کے آثار پیدا کر دیئے تھے حکومت نے ..... قدم قدم پر بھوک کھڑی تھی جیبھ نکالے۔ انسانیت۔ آدمیت اور محبت در بدر بھٹک رہی تھی لوگ پیٹ کی خاطر چوری اور خون کرتے ہیں۔ نا امیدی کے ڈر کی وجہ سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُمید کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں۔ امیروں کی گالیوں کی بوچھاڑ سہتے ہیں۔ در بدر کی خاک چھانتے ہیں۔ ہند کی جوان بیٹیاں ایک ایک پیسے کے لئے ہاتھ پھیلا دیتی ہیں اور وقت کے تھپیڑوں سے پامال ہو کر وہ اپنی عصمت تک اس پیٹ کی آگ کے ارپن کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہیں۔

اُن دنوں کلکتہ میں نکلس روڑ سے پرے ہٹ کر اس چار منزلہ عمارت کے ایک چھوٹے سے کمرہ میں وہ لوگ رہتے تھے۔ کلکتہ جیسے شہر میں ایک غریب آدمی کے لئے اس سے بڑی جگہ لے کر رہنا مشکل ہی سمجھئے اور پھر جبکہ اُن کی چھاتی پر سل سی ایک جوان لڑکی دھری ہو۔

اس چھوٹے سے کمرے میں رہتی تھی مالتی۔ اس کی ماں، چھوٹا بھائی اور چھوٹی بہن لیلا اور رات بھر کے لیے اس کے پتا...... راجن! سویرے ہی کچا پکا کھا کر وہ کام پر چلے جاتے اور دن چھپے ہی واپس آتے تھے۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا کر چھت پر چلے جاتے اور دو ایک بیڑی کا دھواں اُگل کر دماغی سکون حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے اور بعض اوقات دن بھر کی محنت سے چور ہو کر بغیر کچھ کھائے ہی سو جاتے۔

جب مالتی کبھی کبھار اپنی کوئی چھوٹی موٹی فرمائش لے کر دھیرے دھیرے اپنے

پتا کے قریب پہونچتی تو اس کے سندر مکھڑے کو دیکھ کر راجن بابو کا دل مامتا و پیار سے بھر جاتا...... "بیٹی رانی...... !" وہ میٹھے لہجہ میں کہتے۔ اور مالتی اُن کی بات سننے کو رک جاتی...... لیکن بات ہمیشہ ادھوری ہی رہ جاتی...... جوان لڑکی سے راجن بابو یہ کیسے کہتے کہ اس کے بیاہ کی فکر انہیں گھن کی طرح رات دن کھائے جا رہی ہے۔
"کیا ہے بابو جی ــــ ؟" ایک لمحہ کے لئے مالتی رک کر پوچھتی۔
"کچھ نہیں بیٹی! جاؤ کھانا کھالو۔" مالتی چپ چاپ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو اپنی میلی کچیلی دھوتی میں چھپائے چلی جاتی۔
راجن بابو سَو روپے ماہوار کے کلرک تھے۔ اس سے زیادہ کمانا شاید ان کی قسمت ہی میں نہ تھا اور پھر ایک ہندوستانی کلرک کی قسمت ہوتی بھی کیا ہے۔ وہ تو دوزخ کے گنہگاروں میں سے ایک گنہگار ہوتا ہے، جس کو وہاں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے بھگوان ایک کلرک بنا کر اس کو ہندوستان میں بھیج دیتا ہے۔ اور آئندہ بننے والے پاپیوں کو اس کلرک کے گھر پیدا کر دیتا ہے۔
بس انہی روپوں میں گھر کے پانچ انسان پیٹ پالتے تھے۔ مالتی کا چھوٹا بھائی پانچ سال کا ہی تھا۔ اور چھوٹی بہن آٹھ برس کی۔ اِن دونوں کا جی بہلانا، دونوں کی پڑھائی کا خیال رکھنا مالتی کا ہی کام تھا۔
مالتی جوان ضرور تھی اور اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا ایک جوان دل بھی۔ مگر...... جوانی کی رنگین اُمنگیں وقت کے تھپیڑوں سے پامال اور غریبی کی چٹان کی ٹکر سے ریزہ ریزہ ہو کر دل ہی دل میں دبی سسکتی رہیں...... یہ بات نہیں کہ مالتی اپنی شادی کے متعلق نہ سوچتی ہو۔ وہ رات کو دھرتی پر اپنے بستر پر پڑی یہی سوچتی رہتی...... کیا اس اتنی بڑی دنیا میں کوئی نہیں جو اس کو اپنا کر لے جائے تاکہ اس کے ماں باپ کی فکر دور ہو مگر اس کو اپنانے والا کوئی ہو بھی تو! اور اگر کوئی مل بھی جائے تو جہیز...... ؟؟
شادی کی منڈی میں ایک خاص پیشگی لئے بغیر کون ایک ہندو لڑکی کو قبول کرتا ہے۔
سماج کے ٹھیکیدار سوسائٹی کے دشمن ہیں اور انسانیت کی پیشانی پر سیاہ داغ ہیں۔

جہیز اور تلک دان سماجی فرض نہیں بلکہ طبقہ نسواں کی پیشانی پر بدنما دھبے ہیں۔ بھلا اس سے بڑھ کر صنفِ لطیف کی اور کیا توہین ہوگی کہ وہ صنفِ قوی کو بطور رشوت کے ایک کثیر رقم ادا کرے۔ یہی وجہ ہے جو ہماری سوسائٹی اتنی گر گئی ہے اور انہیں شرمناک فرائض اور بدترین اصولوں کی وجہ سے غیروں کی نظر میں گری ہوئی ہے۔ اس کے تمام قوانین ٹھکرا دینے کے قابل ہیں۔ یہ موجودہ دور کی سب سے بڑی لعنت ہے۔

راجن بابو کے پاس چاندی کے چند ٹکڑے نہ ہونے کی وجہ سے مالتی کی شادی کا سودا کہیں نہ ہو سکا۔

وقت کا پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا اڑتا جا رہا تھا یکایک جاپانیوں نے برما پر حملہ کر دیا۔ چاروں طرف ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ دشمن برما میں تھا اور کلکتہ میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ ڈرتے، کانپتے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے ہر شخص کہیں نہ کہیں بھاگ جانے کے لیے بے تاب تھا۔ جاپانی اب آئے اور اب آئے یہی سب لوگوں کا خیال تھا کلکتہ میں ہندوستانی فوجیں آگئیں اور الٹ پلٹ ہونی شروع ہوگئی۔ چیزوں کے دام ایکدم بڑھنے لگے بازاروں میں دوکانیں سونی پڑ گئیں۔ نہ جانے سب کچھ کہاں چلا گیا۔

راجن بابو کے چھوٹے سے کنبہ میں بھی بھاری ہل چل مچ گئی۔ دفتر سے مہنگائی الاؤنس ملنے پر بھی گزارا چلنا مشکل ہو گیا الاؤنس تھا پندرہ روپے اور بازار میں دام دُگنے چوگنے اور چھ گنے ہو رہے تھے۔ مالتی کی دھوتی اور بھی میلی اور پیوند دار ہو گئی۔ بال بھی خشک رہنے لگے۔ راجن بابو کے کپڑے گھر پر ہی دھلنے لگے اور ساتھ ہی ان کی مرمّت بھی ہونے لگی۔ دفتر کے لئے ایک صاف ساکوٹ اور دھوتی ہونا لازمی تھا کیونکہ ایک سو پندرہ روپے دیکر، دفتر اپنے بابو کو پھٹے کپڑوں میں تو نہیں آنے دے گا کیونکہ انگریزی راج تھا نا...... ! جنگ کے حالات اور مہنگائی نے چھوٹی سی لیلا اور کمار کو بھی سمجھا دیا تھا کہ اب کھانے پینے کا گزارا مشکل سے ہی ہو سکے گا...... لیکن پیٹ کی آگ کا کیا کریں ـــــ ؟ تیسرے پہر سے شام تک کا وقت کاٹنا اُن کے لئے پہاڑ

ہوجاتا تھا۔ راجن بابو کہتے ..... "نہ جانے اس لڑائی کا کب خاتمہ ہوگا۔" لڑائی کا خاتمہ تو نہ ہوا مگر بازار میں چاولوں کا خاتمہ ضرور ہوگیا، یہ کون جانے یا بتائے ..... لیکن اتنا تو مالتی، کمار اور لیلا سبھی جان گئے کہ چاولوں کی قیمت دن دوگنی اور رات چوگنی بڑھ رہی ہے۔ راجن بابو کے گھر میں کھانا اب ایک ہی ٹائم پکنے لگا۔ بچوں کے چہرے کمہلا گئے۔ مالتی کی جوانی بھی روٹھ گئی۔ راجن بابو اور اُن کی دھرم پتنی بوڑھے لگنے لگے۔ کلکتہ میں لوگ بھوکوں مرنے لگے فٹ پاتھوں پر بھوک سے دم توڑنے والوں کو مالتی نے بھی دیکھا ماں اور بچوں نے بھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا رہتا تھا۔ سب کو اپنی ہی پڑی تھی۔

ایک روز مالتی نے دیکھا کہ لیلا بیمار ہوگئی، کیا کیا جاتا ــــ؟ نہ دوا ملتی تھی نہ روٹی۔ آخر ایک دن وہ بے چاری کھیلتی ہوئی برآمدے میں گر پڑی اس کی ربڑ کی گڑیا چھاتی پر پڑی تھی اور معصوم آنکھیں آسمان کی طرف کھلی ہوئی آسمان سے روٹی مانگ رہی تھیں۔ کچھ دن بعد ماں بھی مالتی اور کمار کو اکیلا چھوڑ گئی۔

ایک دن سویرے اُٹھنے پر مالتی نے دیکھا کہ راجن بابو کو بھی بخار ہوگیا۔ مالتی کا دِل کانپ اُٹھا ــــ..... اب کیا ہوگا۔ دفتر تو جانا ہی پڑا۔ مگر واپس آکر وہ زیادہ بیمار ہوگئے ...... دو چار دن کے بعد ہی گھر میں کھانے کو کچھ نہ رہا۔ پیٹ کو تو کچھ نہ کچھ ضرور دینا تھا، مگر کیا کھاتے ..... آگ یا انگارے یا آسمان سے توڑ کر کھائے تارے۔ ..... مالتی مجبور ہوکر ایک پڑوسن کے پاس گئی سر جھکائے اٹک اٹک کر اس نے اپنی مصیبت سنائی۔ پڑوسن نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر مالتی کا منہ اوپر اٹھایا ..... آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"شاید تم سوچتی ہوگی کہ ہمارے پاس چاول ہیں۔ لیکن ہمیں کھانا کس طرح ملتا ہے، جانتی ہو؟"

"نہیں!" مالتی نے سر ہلا کر جواب دیا۔

پڑوسن نے سب کچھ بتایا۔ مالتی پتھر کی طرح خاموش سنتی رہی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا ...... "ہائے رام، یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔؟ وہ ایسا کبھی نہ کر سکے گی۔!" وہ گھر واپس آگئی۔ لیکن بیمار پتا کو دیکھ کر وہ کانپ اٹھی۔ کمار بھوکا

کے مارے بلک رہا تھا۔ اس کی خاموش نگاہیں روٹی مانگ رہی تھیں..... روٹی.... چاول..... روٹی......

مالتی نے چاہا کہ چھت پر سے کود پڑے۔ زہر کھالے..... اتنے میں راجن بابو نے پکارا ــــ "بیٹی! کیا گھر میں کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے؟ دیکھو تو کمار کا کیا حال ہو رہا ہے!" مالتی نے اپنے ہاتھوں سے اپنا کلیجہ دبا لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے تمام کلکتہ جل رہا ہے.........!!

شام کے گہرے سائے اُفق کی پیشانی پر منڈلانے لگے۔ دن کی چتا جل کر سرد ہو چکی تھی، مگر ان تین بیچوں کے پیٹ کی چتا اور بھی بھڑک رہی تھی۔ مالتی کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ شہر میں انسانوں کی بجائے بھوتوں کا راج ہو گیا ہے۔ جو ان تینوں کو بھوکوں مار کر تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن...... وہ نہیں مرے گی۔ کم از کم کمار اور بابوجی کو ضرور بچائے گی۔ لیلا اور ماں تو...... نہیں، نہیں! مالتی پڑوسن کا کہنا مانے گی...... "ابھی آئی، بابوجی چاول لاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف دوڑ گئی...... کمار کی آنکھوں میں چمک جاگ اُٹھی...... اور وہ ٹکٹکی لگائے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

بلیک آوٹ ہونے کی وجہ سے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ پورا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا اطیش میں آئے ہوئے کالے ناگ کی طرح پھنکار رہی تھی، اور مالتی پڑوسن کے ساتھ منہ ڈھک کر بھیک مانگ رہی تھی...... ہاں بھارت کی ایک بیٹی، شرم و حیا کے پردے میں لپٹی بھیک مانگ رہی تھی۔ یکایک کسی نے اس کے جسم کو چھو لیا۔ مالتی چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔ چھونے والے نے ہنس کر کہا ...... "اوہو بھیک مانگنے پر بھی اتنا نخرہ!"

مالتی پھولوں کی بیل کی طرح کانپنے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس ڈراؤنے اندھیرے میں وہ کلکتہ میں نہیں، دوزخ میں پڑی ہے۔ جہاں چاروں طرف سے بھوکے درندے اس کو کھانے کے لئے آرہے ہیں۔

"ایک بار مکھڑا دکھا دو تو سیر بھر چاول دوں گا" ایک عزت دار "بھلے آدمی" نے ہنس کر کہا۔

ایک سیر چاول!...... کمار! بابوجی!...... لیلا! ماں...... مالتی کا خون

جمنے لگا۔
کسی نے ہاتھ بڑھا کر گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ مالتی پتھر کی مانند کھڑی تھی۔ "اُف، کتنی سندر ہو تم!" اس بھلے آدمی نے مالتی کی ٹھوڑی کو پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

آسمان میں تارے انسان کی انسانیت پر غصہ کے مارے تلملا رہے تھے چاند بھی غیرت کے مارے اپنی صورت بدلی میں چھپا رہا تھا۔ خیانت کے بھوت کلکاریاں مار رہے تھے۔ خود غرضی، چڑیل کی شکل بنائے دانت کٹکٹا کر ہنس رہی تھی ......اور بھارت کا ایک سپوت، مالتی کو، اس کی عصمت کی قیمت میں ایک سیر چاول دے رہا تھا۔!

●●

فیروزی شال

میٹھی میٹھی ٹھنڈ پڑنی شروع ہوگئی تھی۔ دن چھوٹے ہو جانے کی وجہ سے سورج کی آخری کرن کو رات کی اُوڑھنی نے جلد ہی ڈھک لیا تھا۔ دن بھر کی محنت و مشقت سے ہارے تھکے مزدور اپنے ٹھکانوں کی طرف نڈھال ہوئے اس طرح چلے جا رہے تھے گویا کہ زندگی کے کفن کے بوجھ سے دم اکھڑ گیا ہو۔ مجبور و بیکس زندگی کی نوکیلی دراڑوں سے گذرتے ہوئے ان بچارے غریب لوگوں کو دیکھ دیکھ کر میرا من اُوب چکا تھا اور ذہنی طور پر پوری طرح ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ چنانچہ دلی سکون حاصل کرنے کی غرض سے میں انگلش بک ڈپو میں جا پہنچا، اور انگریزی و ہندی رسالوں کی ورق گردانی میں محو ہو گیا۔ دفعتاً کسی کی تیکھی نوک والی جوتے کی ٹھوکر سے میرا پاؤں کچلا گیا۔ اور میں تڑپ کر رہ گیا۔
.... فوراً ہی شیریں آواز میں سوری (SORRY) کے شبد نے مجھے چونکا دیا..... فیروزی ساڑھی میں ملبوس ہیئر کٹ کا فر جوانی بجلیاں گراتی ہوئی قریب سے گذر گئی۔ شاید ناراضگی اور شرمندگی کی میل دور کرنے کیلئے ''سوری'' سے بہتر کوئی صابن نہیں۔ اس جگہ پر اکثر ایسی ہی قسم کے لوگ باگ آتے ہیں جو انگریزی میں بولنا معیارِ قابلیت سمجھتے ہیں۔ لہذا وہاں پر بھی دل کو اصلی سکون حاصل نہ ہوا۔ آخر و جے چوک سے ہوتا ہوا دُرگا پٹرن روڑ کی طرف چل دیا۔

اس سڑک پر شام کے پانچ بجے سے سات بجے تک ایک قابل دِید منظر ہوتا ہے رات کی رانی کی خوشبوؤں، لہراتی ہوئی آوارہ زلفوں، معصوم اداؤں، اور بے باک حُسن کی آنکھ مچولی دیکھ کر انسان زندگی کی تلخ حقیقتوں کو کچھ دیر کے لیے فراموش کر کے اس رنگین ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔ اور سمجھنے لگتا ہے کہ وہ جنت میں آپہنچا ہے جبکہ یہ ایک معمولی سڑک ہی ہے، جہاں شام کے وقت غیر معمولی بھیڑ ہو جاتی ہے، کیونکہ

لے دے کے یہی ایک ایسی سڑک ہے جسے شملہ کا مال روڈ سمجھ لو یا بمبئی کا مرین ڈرائیو
اور چاہے دِلی کا چاندنی چوک کہہ لو یا کلکتہ کی چورنگی۔
ہاں تو اُس روز بھیڑ کچھ زیادہ ہی تھی۔ رنگ برنگی تتلیوں کے جھنڈ موٹے پتلے لمبے
ناٹے، گورے کالے، سبھی میل کے جوڑے، بھڑکیلی پوشاکیں پہنے چہل قدمی کر رہے
تھے۔ بعض جوڑوں کو تو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا ہے کہ فلمی ہیرو ہیروئن کسی فلم کی
شوٹنگ کے لئے جلوہ گر ہو رہے ہیں اور کسی کسی جوڑے کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ گدھے
کو گلقند مل گیا ہو...... صدر بازار کے پل کے نکڑ پر ہی گندے نالے کے ساتھ ساتھ
ایک نیا بازار بنا ہوا ہے، جہاں ریڑھیوں پر پرانے گرم کوٹ، پینٹ وغیرہ بہت
سستے داموں میں اسقدر شور و غل کے ساتھ فروخت ہوتے ہیں۔ جیسے سبزی منڈی میں
گاجر مولی۔ اسی خاص پوائنٹ پر موتی پکوڑے والے کی ریڑھی پر شام کے وقت
بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ ان میں زیادہ تر "لال پری" کے شیدائی ہوتے ہیں..... اِس
پکوڑے والی ریڑھی پر کلوا باقاعدہ آتا رہا تھا، غم غلط کرنے کے لئے...... لیکن
جب سے اس کے ساتھی بھیکو نے اس کو پھٹکارا اور لعنت ملامت کی، اس نے اِدھر کا
رخ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس روز کلوا اور بھیکو دونوں ہی وہاں کھڑے پکوڑے
کھا رہے تھے، اور تب کلوا نے ذرا اچھل کر کہا...... "ارے بھیا! پیتے تو بڑے لوگ
بھی ہیں۔ ہمارے بھٹے کے مالک تو پی کر دُھت رہتے ہیں۔"
"ارے کلوا! تو نا ہی جانت...... یہ بڑے لوگ جو بھی ایسا ویسا کام کرت
ہیں تو وہ اُن کا شوق کہلاوے ہے۔ اور اگر وہی کام اپنے جیسا چھوٹا آدمی کرے، تو عیب
بن جاوے ہے......!" پکوڑے کھا کر کاغذ پھینکتے ہوئے بھیکو نے شکستہ آواز میں کہا
اور پھر دونوں صدر بازار کی طرف ہو لیے۔
دورِ خزاں کے تھپیڑوں سے پامال شدہ لاغر سا جسم والا ناٹے قد کا کلوا بیتے
ہوئے دنوں کا بوجھ اٹھائے، اپنے خیالات کی دنیا میں غرق ہچکولے کھاتا ہوا ہولے
ہولے چل رہا تھا۔ قدم کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا پڑ رہا تھا اس کے جسم کا اندرونی حصہ

باہر نکل آیا تھا۔ سانولے چہرے پر نمودار گہری جھریاں، بیتی ہوئی مصیبتوں و مشکلوں کا جشن منا رہی تھیں۔ اس کے پلاسٹک کے جوتے کچھ حسین دکھائی دیتے ہیں۔ مگر میلی کچیلی دھوتی اس کی جوانی کی طرح بوسیدہ ہو چکی تھی۔ اور چار برس پہلے ریڑھی والوں سے پانچ روپوں میں خریدا ہوا گرم کوٹ میرے آزاد وطن کے غریب مزدور کو ٹاٹا کہہ رہا تھا۔ سر کی پگڑی اُس کی خستہ حالی پر اگرچہ غمگین نظر آ رہی تھی، لیکن پگڑی کی بچی کھچی سفیدی کلوا کے اخلاق و انسانیت کی شان و عظمت کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ یہ بات الگ ہے کہ قسمت نے اس کو اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے ایک مزدور کے گھر پیدا کیا.... کیچڑ، مٹی اور گارے کا کام کرنے والے مزدور کا بیٹا بھی مزدور ہی بنتا ہے۔ منسٹر یا آفیسر بننے کا تو وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔

چلتے چلتے وہ کسی خاص دکان کو پُر معنی نگاہ سے گھورتا اور رُک جاتا مگر کچھ سوچ کر پھر آگے بڑھ جاتا۔ ایک دکان کے آگے پہنچ کر کلوا نے بھیکو کو آہستہ سے کچھ کہا اور اپنے بوسیدہ گرم کوٹ کی اندر والی جیب سے دس دس کے چند نوٹ نکال کر ایک بار بغور گنے۔ اور پھر جھٹ جیب میں رکھ لیے۔ جیسے انھیں خرچ کرنے کو اس کا من نہ مانتا ہو...... اور پھر کسی خیال کے زیر اثر وہ کپڑے والے کی دُکان میں داخل ہو ہی گیا...

آج اس کو بچوں کے لئے تھوڑا سا کپڑا ضرور خریدنا تھا۔ چنانچہ کپڑوں کے نمونے دیکھتے وقت دفعتاً اس کی نظر سامنے لٹکی ہوئی فیروزی شال پر جا پڑی اور ٹکٹکی لگ گئی۔ بجلی کی روشنی میں شال کے چمکتے ہوئے فیروزی رنگ نے اس کی گذشتہ زندگی کا ایک اہم واقعہ تروتازہ کر دیا...... کتنی معمولی سی فرمائش تھی ایک فیروزی شال، جبکہ سہاگ رات کو اس کی بیوی رام کلی نے نہایت معصومانہ انداز میں کہا تھا....، مجھے تو صرف ایک فیروزی رنگ کی شال لا دو......! مگر ہائے رے غریبی! پندرہ سال بیت چکنے پر بھی وہ بے چارہ اپنے جیون ساتھی کی یہ ایک چھوٹی سی مانگ نہ پوری کر سکا..... ہر سال رام کلی اپنی فرمائش دوہرا دیتی اور غربت کے ہاتھوں مجبور کلوا کوئی نہ کوئی خوبصورت بہانہ بنا کر اسے آئندہ سال کے لیے ٹال دیتا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی قسمت کو کوستا ہوا اس

دنیا کے مالی سے فریاد کرتا۔ ہو..... ہے بھگوان! تو نے اس دنیا میں غریب بنائے ہی کیوں؟ اور اگر بنانا ہی منظور تھا، تو ان کی جھولی ناقابل برداشت مصیبتوں سے کیوں بھر دی..... تیری اس دنیا میں سیٹھ ساہوکار۔ راجے مہاراجے ہیں جو رات دن خوب رنگ رلیاں مناتے ہیں...... بھلا انھیں کیا معلوم کہ سنسار میں صرف خوشی کی لہریں اور مسرتوں کی تھپکیاں ہی نہیں۔ بلکہ غم کے تھپیڑے اور موت کے چھینٹے بھی ہیں..... یکایک اسے خیال آیا کہ دوسرے اور لوگ تو بیوی کے ذرا سے اشارے پر ہی زمین و آسمان کے قلابے ملانے پر تل جاتے ہیں.... لیکن ایک وہ ہے جو پندرہ سالہ پرانی ایک چھوٹی سی مانگ بھی پوری کرنے میں اب تک ناکامیاب رہا..... وہ خود کو ایسا بے بس انسان تصور کرتا تھا جو وقت کی صلیب پر لٹک رہا ہو...... اور پھر دوسرے ہی لمحہ اُس کا ہاتھ خود بخود نوٹوں والی جیب کے اندر گھس گیا...... لیکن پھر اچانک ایک سو بیس روپے شال کی قیمت سنتے ہی اس کا ہاتھ جیب کے اندر ہی اٹک کر رہ گیا...... یہ قیمت بہت زیادہ ہے .... اور پھر اس مہینے تو رام کلی کی بیماری کا بل بھی ڈاکٹر کا چکانا تھا...... راشن کے لئے بھی پیسے چاہئیں۔ اس مرتبہ تو وہ باپ کی بیماری پر لیے گئے قرض کی قسط بھی ادا نہ کر سکا تھا.... پھر جھٹ کسی خیال کے زیرِ اثر جیب سے نوٹ نکال کر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ایک سو بیس گن کر روپے دکاندار کو پکڑا دیے، اور فیروزی شال لے کر بھیکو کے ہمراہ گھر کی طرف چل دیا وہ من ہی من میں کتنا خوش تھا...... جیسے ناقابل تسخیر قلعہ فتح کر لیا ہو..... مگر ساتھ ہی دوسرے اخراجات کا فکر بھی اس کے دل کو کچوٹ رہا تھا.... بھیکو کے ساتھ کبھی کبھار 'ہاں'، 'ہوں'، کہتا ہوا وہ اپنے خیالات کی ادھیڑ بن میں گھر جا پہنچا۔ اندر داخل ہوتے ہی بچے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ آج اُن کی پُرانی فرمائشیں ضرور پوری ہوں گی۔

بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے بڑے فاتحانہ انداز میں دریافت کیا۔ "ارے للو! تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"اندر کھٹولے پر لیٹی ہیں۔" بچے کا جواب تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بے اختیار بول اٹھا۔" ارے ہو للو کی اماں! لے دیکھ تمہاری فیروزی شال آگئی ہے......! چارپائی پر شال رکھتے ہوئے ذرا متفکرانہ انداز میں پوچھا......" آج پھر کچھ تکلیف ہوگئی کیا......؟؟"

"پسلیوں میں بہت درد ہے. سانس بھی ذرا رک رک کر آ رہا ہے!" اور پھر شال کو ہاتھوں میں کھولتے ہوئے رام کلی نے مرے ہوتے لہجہ میں کہا۔" جوانی کا یہ رنگ اب ان سفید بالوں میں بھلا کیا اچھا لگے گا. ؟" اتنا کہہ کر وہ بے ہوش ہوگئی. لڑکے کو اس کے پاس بٹھا کر کلوا جھٹ سے ڈاکٹر کی طرف دوڑ پڑا. ڈاکٹر آیا اور ایک انجکشن دیکر چند دوائیاں بازار سے منگوانے کی تاکید کی اور اپنی فیس لے کر چلتا بنا۔

رام کلی کو ڈبل نمونیہ ہوگیا تھا. کلوا ساری رات اس کی تیمارداری میں مصروف رہا. اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ دوائی وغیرہ دیتا رہا. مگر واہ ری قسمت! صبح چار بجے کے قریب غریب مزدور کا جیون ساتھی اور دو بچوں کی جنم داتا اس فانی دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلی گئی. بچے محوِ خواب تھے، اور بیچارہ کلوا رام کلی کا سر اپنی ران پر رکھے کھونٹی پر لٹکی ہوئی فیروزی شال کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا اور خیالات میں غوطہ زن تھا، کہ وہ اپنی زندگی میں بیوی کی ایک چھوٹی سی فرمائش پوری نہ کر سکا۔

صبح ہونے پر جب بچوں کو پتہ چلا کہ اُن کی ماں مر گئی ہے. تو انھوں نے رو رو کر کہرام مچا دیا...... ارتھی تیار ہو چکی تھی. لوگ اٹھا کر چلنے ہی والے تھے کہ کلوا نے سسکتے ہوئے انھیں ذرا رک جانے کے لئے کہا اور اندر سے فیروزی شال لا کر ارتھی پر چڑھا دی. لوگوں نے بہتیرا منع بھی کیا. مگر کلوا نے بڑے غمگین لہجہ میں کہا۔ یہ فیروزی شال مرنے والی کی پہلی اور آخری مانگ تھی، جو اُسے مرنے کے بعد ہی میسر ہوئی......" اور وہ غریب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا......!

سُرمئی چاند

گاندھی گراؤنڈ میں میلہ پورے جوبن پر تھا۔ کہیں چھن چھن۔ کہیں کھن کھن کہیں میٹھی جھڑکی تو کہیں شرمیلی ہنسی۔ کوئی منّی کو ڈانٹ رہی تھی، تو کوئی کھلونے والے سے جھگڑ رہی تھی۔ مست جوانیاں انگڑائیاں لیتی اِدھر سے اُدھر تھرکتی پھر رہی تھیں۔ لوگ میلہ دیکھنے میں مست تھے اور موہن میلہ دیکھنے والوں کو دیکھ رہا تھا...... دفعتاً ایک شور سا مچا۔ کافی لوگ دکان کے قریب جمع ہو گئے۔ قریب پہونچنے پر اسے پتہ چلا کہ کچھ کالجی چھوکرے ایک مالا بیچنے والی کے ساتھ جھگڑ پڑے تھے کئی ایک تو بھاؤ بگاڑ کر مالائیں لیتے ہی رفو چکر ہو گئے تھے۔ اور کچھ نچلے بھاؤ ہی پوچھ کر چلتے بنے۔ ”اجی صاحب! بھاؤ تو ایک بہانہ ہے محض چھیڑ چھاڑ کا مزہ لینے کیلئے“ موہن بھی چپ چاپ ایک طرف کھڑا دیکھتا رہا۔

مالا فروخت کرنے والی کا شب رنگ چہرہ۔ سنہری سی زلفیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں، انہوں نے بھی شائد کسی کی راہیں دیکھی ہوں گی...... چیچک کے داغوں سے بھرپور چہرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی چاند گہنا گیا ہو۔ دور خزاں کے تھپیڑوں سے اس کی جوانی اس قدر پامال ہو چکی تھی جیسے کوئی پھول بہاروں میں رہ کر بھی مرجھا گیا ہو۔ بھوک و افلاس کا مارا ہوا جسم بے کسی کی انتہا کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ قدرت کے آرٹ کا یہ انوکھا نمونہ شاید کسی بھی نظر کو گوارہ نہ تھا...... لیکن موہن کو افسانہ کیلئے ہیروئین مل گئی تھی۔ وہ کئی دن سے افسانہ کے اچھوتے پلاٹ کیلئے پریشان تھا بس یہی خیال اس کے دماغ میں دھما چوکڑی مچاتا رہتا...... اچھوتا پلاٹ کہاں

سے لائیں ؟ اس کے یار لوگوں کا مدت سے تقاضہ ہو رہا ہے کہ نیا نویلا پلاٹ پیش کرے۔ مگر ہاتے رام! اچھوتے پلاٹ کا مسئلہ حل کیسے ہو ......؟

دفعتاً موہن کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ کسی اخبار کے "ضرورت ہے" کے کالم میں ایک اشتہار شائع کرا دیا جائے کہ کہانی کے لئے ایک پلاٹ کی ضرورت ہے، پلاٹ اچھوتا، دردانگیز ہو...... لیکن رنگین اور رومانی ہونا لازمی ہے...... چرائے ہوئے پلاٹ کو ترجیح دی جائے گی......! اسے پورا یقین تھا کہ اخبار کے ذریعے اس قسم کی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ لوگوں کو تو اخبارات کے ذریعے بیویاں تک مل جاتی ہیں۔ کیا اسے کہانی کے لئے کوئی بوسیدہ پلاٹ بھی نہ ملے گا......؟ پھر یکایک خیال آیا کہ دیش بھر میں اتنے ہفتے وار۔ پندرہ روزہ اور ماہانہ میگزین شائع ہوتے ہیں۔ اور ان میں سیکڑوں افسانے شائع ہوتے ہیں۔ کیا یہ سبھی اچھوتے ہوتے ہیں......؟

لہٰذا اس نے سوچا کہ کیوں نہ کوئی گھسا پٹا پرانا سا پلاٹ لے کر تھوڑا بہت اِدھر اُدھر سے میک اپ کر کے پیش کر دیا جاتے...... مگر اس کا دل نہ مانا۔ پھر خیال آیا کہ کسی چوری کئے ہوتے افسانہ کو توڑ مروڑ کر ایسے طریقہ سے اس کا روپ بدلیں کہ رہے اللہ کا نام۔ شائع کرنے والے میگزین کی شان بڑھے گی، اور یار لوگوں کے دل بھی پشاوری ہو جائیں گے۔

لیکن اس کے ضمیر نے اجازت نہ دی۔ اس کمبخت اچھوتے پلاٹ کی خاطر وہ بہت بے چین سا تھا۔ اور اسی ادھیڑ بن میں وہ گاندھی گراؤنڈ میں جا پہونچا تھا۔

میلے میں بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ کہیں کہیں تو دھکے پہ دھکا لگ رہا تھا اور کچھ منچلے ان دھکوں میں بھی لذت محسوس کر رہے تھے۔ کیونکہ معصوم مست جوانیاں مسکراہٹوں کا قیمتی خزانہ لٹاتی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ اور خرانٹ لوگ اپنی آنکھیں سینک رہے تھے۔ لیکن موہن کی نظریں میلہ دیکھنے والوں کے دلوں کو ٹٹول رہی تھیں۔

غریب بھی تو آخر انسان ہوتے ہیں۔ وہ بھی تو بھگوان ہی کے بندے ہیں اور اُن کے بھی دل ہوتا ہے۔ اور پھر بھلا ان کی غریبی کے ساتھ ایسا بھونڈا مذاق کیوں؟ کیا اس سنسار میں غریب ہونا بڑا پاپ ہے۔"

کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ وقت کے بے رحم پنجوں نے ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ قدرت نے شاید اُن کے ساتھ یہ بہت بڑا مذاق کیا تھا۔ اور اس کے سینے میں عرصہ دراز سے بھڑکتے جوالا نے ذرا سی ہمدردی پاکر آج آنسوؤں کی صورت اختیار کرلی تھی۔ وہ اور بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر آنسوؤں کا سیلاب تھمتا ہی نہ تھا۔۔۔۔۔ ڈھارس بندھانے پر بڑی ہمت کے ساتھ اس نے پھر کہنا شروع کیا اور بولی۔

—" بیٹا! یہ مالا بیچنے والی میری بیٹی ہے۔ ایشور نے اس کو ایسا رنگ روپ دے کر نہ جانے کس پاپ کی سزا دی ہے۔ اور پھر بھاگیہ نے بھی ایسا دھکہ لگایا کہ بچپن میں ہی اس کے پتا جی ہمیں بے سہارا چھوڑ کر چل بسے۔۔۔۔۔"

وہ کچھ رُک سی گئی۔ جیسے اس کے حلق میں کچھ اٹک گیا ہو۔ ایک لمبی سرد آہ بھر کر اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ " اس کے پتا جی فوج میں کام کرتے تھے۔ بڑے بہادر تھے۔ کیونکہ انہوں نے وطن پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے دشمن کے بہت سے جہاز مار گرائے تھے۔۔۔۔۔ بس دیش کی خاطر لڑتے لڑتے جان نچھاور کردی۔ اُن کی بہادری کے کارن بہت سے میڈل انعام میں ملے تھے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ مرنے کے بعد بھی ایک بڑا چمکدار میڈل ملا تھا۔۔۔۔۔ بھلا اِن میڈلوں کی چمک دمک سے پیٹ کی آگ کہاں شانت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ بھلے ہی ہماری پنشن بھی لگا دی ہے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ ہماری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں، بس اسی طرح دن گذرتے چلے گئے۔۔۔۔۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ مہنگائی کے جبڑے بھی پھیلتے گئے۔۔۔۔۔ یہ بچی اور اس کا چھوٹا بھائی بھی بڑے ہوتے گئے۔ لیکن پنشن میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ مگر اس کمر توڑ مہنگائی میں پنشن کی

تھوڑی دیر کے بعد مغرب میں دن کی چتا جل کر سرد پڑ گئی۔ اندھیرے نے اپنے کالے کلوٹے جبڑے چاروں طرف پھیلانے شروع کر دیئے۔ لوگ اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ میلہ اب کافی ہلکا پڑ چکا تھا۔ البتہ دو چار شریر کالج کے لڑکے مالا والی کے پاس آدھمکے اور بھاؤ بنانے لگے۔

"ایک روپے کی دو ملیں گی۔ دام کم نہیں ہونگے بابو...... لینا ہو تو لو...!" اس نے ذرا رک رک کر ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہنہ، روپے کی دو۔ بہت سندر ہے نا۔" ایک لڑکے نے ذرا چھیڑتے ہوئے کہا۔ وہ بے چاری کچھ نہ بولی۔ بلکہ سہم گئی۔ شاید اسے اپنی کمی کا احساس بری طرح سے جھنجھوڑ رہا تھا اور اس کے خشک ہونٹ کپکپا رہے تھے......

لیکن اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر عورت، جو بیتے ہوئے کئی بے رحم برسوں کے بوجھ تلے نڈھال تھی، ذرا تڑک کر بولی۔ "ارے بابو! سندرتا تو تم ہی لوگوں کی لونڈی ہے۔ ہم غریبوں کی سندرتا اور جوانی تو دہلیز ہی سے منہ موڑ کر چلی جاتی ہے.......... اور بس.....!"

شرارتی لڑکے فوراً کھسک گئے۔ اور بڑھیا اپنی مصیبتوں کے بوجھ سے ہانپنے لگی۔ مالا والی کی اندر کی طرف دھنسی ہوئی غلیظ آنکھوں سے دو موتی غریبی کو کوستے ہوئے اس کے بے رنگ رخساروں پر ڈھلک گئے......! یہ دکھ بھرا منظر مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ چنانچہ بڑھیا کے دکھی دل کو ٹٹولنے کی غرض سے وہ اس کے بالکل قریب جا پہونچا۔ اور نہایت ملتجانہ انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

"ماں، اس قدر دکھی کیوں ہو رہی ہو؟" انکساری کے ساتھ محض اتنا ہی پوچھنے پر بوڑھی ماں اس طرح زار و قطار رونے لگی جیسے کسی روتے ہوئے بچے کو جب پیار سے ذرا پچکارنے لگیں تو وہ اور بھی بلک بلک کر رونے لگتا ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پا کر گلو گیر لہجہ میں کہنا شروع کیا.......

بیٹا! اگر ہم غریب ہیں تو اس میں بھلا ہمارا کیا دوش ہے..... اور پھر

سکڑتی ہوئی رقم سے پیٹ کی آگ بجھانا ہی اتنا مشکل ہو رہا ہے پھر بھلا ان بچوں کی پڑھائی کا انتظام کیسے اور کیونکر ہو سکتا ہے؟ ان کی جو عمر کھیلنے کودنے اور پڑھنے کی تھی، جیون سنگرام میں بیت رہی ہے بس اسی لیے یہ بچی مرے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتی ہے اور لڑکا اپنی پڑھائی کے لئے ایک چھوٹا موٹا کام کر کے کچھ پیسے بنا لیتا ہے .... معلوم نہیں یہ دھندہ اس طرح کب تلک چلے گا .... بنا باپ کی اس بچی کی شادی بغیر جہیز کے کیسے ہوگی، بھگوان ہی جانتا ہے ..... آنے والی پڑھیاں ہماری اس پنشن اور چمکدار میڈلوں کے بارے میں بھلا کیا سوچیں گی .... یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"

وہ کہتے کہتے رک گئی، جیسے مستقبل کے اندھیرے میں اس کا دل و دماغ گم ہو گیا ہو۔ یکایک نزدیک ہی دیوی مندر میں شنکھ اور گھڑیال بجنے شروع ہو گئے۔ بڑھیا نے بچی ہوئی دو مالائیں موہن کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ جاؤ بیٹا! تم بھی دیوی ماں کو ہار چڑھا دو .....!"

موہن نے وہ مالائیں احترام کے ساتھ جھٹ بوڑھی ماں کے قدموں میں رکھ دیں۔

"ارے یہ کیا کیا تم نے ....؟" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

"تمہیں نے تو کہا تھا کہ دیوی ماتا کو چڑھا دو .... میرے لئے تم ہی سب کچھ ہو۔ بھلا ماں کی صورت کے آگے بھگوان کی صورت کیا ہوگی"۔ جسے ابھی تک دیکھا تک نہیں .... اور دنیا و بھگوان کے ٹھکرائے کو صرف ماں ہی تو چھاتی سے لگاتی ہے ....!!"

اس کی ویران اور بجھی بجھی آنکھوں میں ممتا کے آنسو امڈ پڑے اور شنکھ و گھڑیال کی گونج بلند تر ہوتی چلی گئی ....!!

غریب کادِل

رات آدھی بیت چکی ہے۔ نیلے آکاش کا چکرورتی راجہ پونم کا چاند اپنی تمام تابانی کے ساتھ دُنیا کا بغور جائزہ لے رہا ہے کہ خاموشی کی حکمرانی میں کوئی خلافِ قانون بات تو نہیں کرتا۔ سب لوگ محوِ خواب ہیں۔ چرند پرند سبھی مدہوش پڑے ہیں۔ دُودھ سی چاندنی پہاڑی وادیوں، جنگلوں، بیابانوں اور گلستانوں میں بکھری پڑی ہے۔ چودھویں کا چاند سب کو ہی برابر چاندنی بانٹ رہا ہے۔ وہ راجہ کے محل اور غریب کی جھونپڑی دونوں پر یکساں چمک رہا ہے۔ اس کی روپہلی کرنیں فلک بوس عمارتوں کو چوم کر تنگ و تاریک گلی کوچوں سے گزرتی ہوئی ایک متوسط درجہ کے مکان پر ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں۔

اس سکوت کے عالم میں ذرا سی جنبش بھی ہولناک محسوس ہوتی ہے۔

اسی عالم میں ہی سامنے والی گلی کے مکان سے ایک سایہ نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ سایہ آہستہ آہستہ آگے ہی آگے بڑھا چلا جا رہا ہے۔ یہ کوئی بھوت پریت نہیں، بلکہ خدا کا ایک بندہ ہے۔ پاؤں سے ننگا، سر لٹکاتے دھیرے دھیرے چُپ چاپ آگے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ گلی سے نکل کر بائیں طرف کو ہو لیا۔ اس کے مُڑنے سے اس کا چہرہ صاف نظر آتا ہے چہرے پر مایوسی کے آثار صاف نمایاں ہیں۔ وہ خود نہیں جانتا کہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔ قدم خود بخود دھیرے دھیرے اُٹھ رہے ہیں اور وہ چلا جا رہا ہے.................!

وہ دیکھیئے! یہ تو سیٹھ دیندیال ہے تمام شہر کے غریبوں کا دل۔ گرد و نواح کی گندی و تاریک بستیوں میں رہنے والے بے بس، بیکس غریب لاچاروں کا وہ

اکلوتا سہارا ہے۔ ناامیدوں کی ایک آس اور بے زبانوں کی آواز ہے......
غرض کہ جیسا نام ویسا ہی کام۔ یہ تمام سادہ لوح خداپرست نیک دل انسان،
خدمتِ خلق کا نایاب مجسمہ ہے۔ محنتی۔ خوش اخلاق و خوش لباس اور پرہیزگار، شرافت
کا پتلا دینہ یال اسی متوسط درجہ کے مکان میں رہتا ہے۔

اس کو اسی کوچے میں رہتے ہوئے کئی برس گزر گئے اپنی بے مثال و بے حد
مقبول صفات کی وجہ سے وہ گلی محلہ والوں کے دلوں میں اچھی طرح سما چکا تھا۔
عوام و خواص اس کے منہ پر قدر و منزلت کا اظہار کم کرتے۔ مگر مصیبت کے وقت
سبھی لوگ جو اس کی نیک نامی و نیک نیتی پر فدا تھے، اس پر اپنا سب کچھ نچھاور
کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے۔

دینہ یال بھی خدمتِ خلق کے سنہری جذبے کے تحت خود کو خوش نصیب
تصور کرتا ہے۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ دولت کی افراط انسان کو انسان نہیں رہنے
دیا کرتی۔ دولت ایک تیز رفتار گھوڑے نما ایسا بھونڈا نشہ ہے جو انسان کو انسانوں
کی برادری سے باہر دھکیل دیتا ہے۔ اس کی حرص، اس کا لالچ انسانیت کا درجہ گھٹا
دیتی ہے اور مہاشہ دینہ یال اپنی انسانیت و اخلاق کو کسی بھی قیمت پر بیچنا نہیں
چاہتا۔ وہ جانتا ہے کہ بے شک دولت ہی سے آدمی کے کام کاج بنتے اور
سنورتے ہیں۔ روپیہ پیسہ بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ مگر سب کچھ نہیں ——— !
آدمی صرف روپیہ پیسہ سے ہی دولت مند نہیں کہلاتا۔ دینہ یال بہت امیر آدمی ہوں
گے مگر اس کی امارت نے کبھی اس کو متکبر نہ بنایا۔ وہ دولت کو ذرّہ بھر بھی وقعت
نہیں دیتا۔ وہ کھلم کھلا کہا کرتا تھا کہ ——— میری دولت ——— صرف میری ہی نہیں
ہے۔ بلکہ اس پر خلقِ خدا کا بھی حق ہے۔

بھوکے کو روٹی۔ بیمار کو دوائی اور تنگ دست کی خاموش امداد اسی
دینہ یال کے اشارے پر ہر ضرورت مند کو بہ آسانی میسر ہو جاتیں۔ اخلاقاً گرے
ہوئے تنگ دل لوگ اکثر کہتے رہتے کہ اس کے پاس خود رہنے کے لئے ایک معمولی سا

مکان اور دیکھ بھال کے لئے صرف بوڑھا باپ ہے، پھر بھلا دولت کی افراط کیا معنی رکھتی ہے اس کی آمدنی کا بہت تھوڑا حصّہ ہی ان دو بندوں کے کبنے کے لئے بہت حد تک کفیل ہو سکتا ہے۔ ان عقل کے اندھوں کو بھلا وہ کیسے سمجھاتے کہ اُس کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ اس کی فیکٹری میں کام کرنے والے سبھی ورکرز کنبے میں شامل تھے۔ جن کی دیکھ بھال، پرورش اور نگہبانی اس کے ذمّہ تھی۔ وہ اگر چاہتا تو دوسرے لوگوں کی طرح عیش عشرت کر سکتا ہے اگر وہ چاہتا تو باغ باغیچوں اور عالیشان بنگلے کوٹھیوں کا مالک بن جاتا۔ ایک سے ایک بڑھ کر کاریں دروازے پر کھڑی ہوتیں بہت سے نوکر و خدمت گار اس کی سیوا میں ہر وقت حاضر رہتے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدمتِ خلق کا جذبہ اس کے خون میں اس قدر گھل مل چکا ہے کہ انسانی محبّت کی بے حساب کشش نے اس کے دل کا رشتہ گلی محلّہ کے ہر فرد و بشر سے ہمالیہ کی مانند مضبوط کر دیا ہے........ اخلاق انسان کو تو کیا پتھر کو بھی موم کر دیتا ہے۔

خدا کے بندوں کی خدمت کرنے کا جذبہ ایسا جادوئی اثر رکھتا ہے کہ دل کو سکون کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ اطمینان اور دلی سکون ہی سب سے بڑی دولت ہیں۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے ہر انسان زندگی بھر جدوجہد کرتا رہتا ہے.......... چنانچہ دینڈیال بھی بے دھڑک ہو کر کہا کرتا تھا ـــــــ " مجھ کو من کی شانتی مل گئی ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے......

؎ دل ہی ہمارا ہے دولت ہماری

اس کی چھوٹی سی فیکٹری میں ہر ضرورت مند کو کوئی نہ کوئی کام مل جاتا اور رواجب اُجرت کے علاوہ وقتاً فوقتاً جائز مراعات بھی دستیاب تھیں۔ فیکٹری میں کام کرنے والے سبھی لوگوں کو دینڈیال اپنے کُنبے کا ممبر سمجھتا تھا اور اسی لحاظ سے اُن کی پرورش میں جٹا ہوا تھا......... مگر ہائے رے قسمت...... .... قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا........ دینڈیال جیسا خدا ترس و نیک

دل انسان بڑی مشکل ہی سے آتا ہے اس جہاں میں۔ اور زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا ……… ! ہوا یوں کہ حسد کرنے والوں کو دینڈیال کی اس قدر ہر دلعزیزی برداشت نہ ہوئی۔ جیسا کہ سمندر میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ اِدھر بڑے کارخانے داروں نے اس کی چھوٹی سی فیکٹری کو ہڑپ کرنے کی ایک خفیہ سازش تیار کی۔ اور مہاشہ دینڈیال کے خلاف ایک جھوٹا کیس رجسٹرڈ ہو گیا۔ اس کی چھان بین کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن بھی مقرر کر دیا گیا……… دینڈیال کو یکدم زبردست صدمہ پہنچا۔ اس کے دل و دماغ پر بہت سخت ضرب لگی۔ بے رحم بے غیرت و بداخلاق لوگوں کے ہاتھوں اپنے اطمینان اور دلی سکون کی دولت کو یوں لُٹتے دیکھ کر بے چارہ دینڈیال بے حد مایوس ہو گیا۔ اگرچہ اُس کی نیک دِلی کے پرستار اس پر جان چھڑکنے کے لئے تیار تھے۔ مگر اُس کو اُمید کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شہر کے کئی بارسوخ لوگوں کو خرید لیا گیا تھا تاکہ دورانِ انکوائری کوئی بات بحق دینڈیال نہ کہہ دیں……… اِس دنیا میں بھلا کیا نہیں ہوتا۔ ؟ لیکن جن لوگوں کی رگوں میں انسانیت کا خون تھا وہ سب دینڈیال کے ساتھ تھے لیکن پھر بھی دینڈیال کو چاروں طرف مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی۔

بیکسی و بے بسی کے عالم میں بھیگی ہوئی اِک شام کی دہلیز پر بیٹھا بے چارہ دینڈیال دِل کے سِسکنے کا سبب ڈھونڈ رہا تھا……… اس نے کبھی بھی کسی غریب کے دِل کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی اور نہ ہی کِسی مجبور انسان کا دل کبھی دُکھایا تھا۔ مگر پھر بھی اس کے سکون کی سلطنت لُٹ گئی تھی…… آخر ایسا کیوں۔ ؟ اُس کو رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ یہ انکوائری کمیشن اور عدالتیں صرف فیصلہ کر سکتے ہیں۔ انصاف نہیں……. انصاف تو صرف بھگوان کی ہی عدالت میں ہوتا ہے……. یہ بات الگ ہے کہ وہ انصاف ذرا دیر سے ملتا ہے کیونکہ انصاف کے طلب گاروں کی بے پناہ تعداد کے مقابلہ میں عدالت صرف

ایک ہی ہے ....! وہ اپنے خیالات کی رَو میں بہتا رہا..........رات سوتی رہی۔ شبنم روتی رہی اور ہلکی ہلکی ہوا چُپ چاپ بہتی رہی ــــ اور پھر دفعتاً کسی کے پاؤں کی آہٹ سے سناٹا ٹوٹ کر چاروں طرف بکھر گیا۔ اور کسی نے آہستہ سے کہا ــــ مُبارک ہو لالہ جی، تم کیس جیت گئے ہو..........یہ سنتے ہی دیندیال کے مُنہ سے خوشی کے مارے چیخ نکل گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف گھُورنے لگا.......... مگر وہاں پر کوئی نہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور زبان تتلا کر رہ گئی..........ـــ

جو سُکھ تقدیر میں نہیں ہوتے

مِل جاتے ہیں وہ سوتے سوتے

وہ چھوٹی موٹی مشکل سے تو کبھی گھبرایا ہی نہیں تھا معمولی پریشانیوں نے اُس کے دِلی سکون واطمینان پر کبھی اثر نہیں ڈالا تھا.......... مگر اب کئی دنوں سے وہ اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے، گلی کُوچوں میں دیوانہ وار گھومتا نظر آتا تھا۔ اسکی قابلِ رحم حالت پر اُس کے مداح سخت مایوس اور پریشان تھے ....!!

اور پھر ایک دِن انکوائری کمیشن نے فیصلہ واقعی دیندیال کے حق میں سُنا دیا۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ سب نر ناری، بچے بوڑھے خوشی کے مارے جھُوم اُٹھے۔ دیندیال کو مبارکباد دینے کے لیے، لوگوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ اُس کے گھر کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ آرہے تھے اور وہ اپنے گھر میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا، چونکہ وہ پریشانیوں میں اُلجھے رہنے کا عادی سا ہو گیا تھا لہذا اُس کو حقیقت بھی خواب نظر آتی تھی وہ جُوں جُوں اس بارے میں سوچتا تُوں تُوں اس کا دِل اُس سے کہتا کہ ــــ نہیں تو خواب دیکھ رہا ہے..........یکایک وہ چونک اُٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر گھُورتا رہا اور پھر اس کے

مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے.......... اگر واقعی فیصلہ میرے حق میں ہو گیا ہے تو میرا دل اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو جائے گا۔ پھر دنیا میں کوئی بھی پریشانی مجھے مایوس نہیں کر سکتی.......!

ایک روز شام کے وقت وہ اپنے گھر میں بیٹھا خیالات کے سمندر میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ قریب کے محلہ میں رہنے والا رحمان جسے سبھی چچا جان کہہ کر بلاتے تھے، اُس کے پاس آیا اور شیریں آواز میں بولا "برخوردار! آپ کو بہت مبارک ہو۔ فیصلہ تمہارے حق میں ہو گیا ہے۔ دیکھا، نیکی کی سدا ہی جیت ہوتی ہے........!" نجانے کیوں چچا رحمان کی یہ بات اُس کو ناگوار گذری۔ فوراً تُند لہجہ میں جھڑک دیا "چل ہٹ، دُور ہو جا میری نظروں سے.... ...... میں تو ابھی سپنا دیکھ رہا ہوں......... فیصلہ تو ابھی ہونا ہے...." آسمان کی طرف ذرا دیکھ کر جھٹ مُنہ موڑ لیا۔!! غریب رحمان کا دِل چُور چُور ہو گیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں مایوس ہو کر لوٹ گیا۔ وہ دیندیال کی سخت کلامی پر حیران ضرور تھا.......... اور لالہ دیندیال دوبارہ اپنے خیالات کے گہرے پانی میں غوطہ زن ہو گیا۔

اگرچہ کیس کا فیصلہ تو ہو چکا تھا اور اب دیندیال کو خوش ہو جانا چاہیے تھا وہ آرام کی نیند سو سکتا تھا۔ مگر اُس کی حالت پہلے سے بھی پتلی ہو گئی تھی اُس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ دماغی توازن کھو چکا ہے ...... پریشانی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے نہ دن میں چین ہے اور نہ رات کو نیند۔ اُداسی اور مایوسی نے اُس کی روح کو حد درجہ تک کھوکھلا کر دیا اس کی بے چینی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ اُسے رہ رہ کر یہی خیال ستا رہا تھا کہ اگر واقعی سچائی کی جیت ہوئی ہے تو پھر پریشانی میں اضافہ کیوں۔؟؟

اِنہی پریشان خیالات میں اُلجھا ہُوا وہ اُس روز نکھری ہُوئی چاندنی میں اپنے گھر سے باہر نِکلا اور ہولے ہولے گلی پار کر گیا۔ یہ وہی خدائی خدمت گار دیندیال ہے جو اپنا کھویا ہُوا اصلی سکون حاصل کرنے کے لیے آدھی رات

سناّ ٹے میں اونگھتے ہُوتے راستوں پر دبے پاؤں چلا جارہا ہے اُس غریب رحمان
کے گھر کی طرف اپنے سچے سکون کی بھیک مانگنے۔ جس کو اُس نے ایک شام
مُبارک باد دینے پر بُری طرح سے دُھتکار دیا تھا۔ دیندیال بخوبی جانتا
تھا اور محسوس بھی کرتا تھا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اِتنی پریشان
کُن اور جان لیوا نہیں جتنا کِسی غریب کے دِل کو دُکھانا........ غریب
کا دِل ہی اُس کا قیمتی خزانہ ہے اور پھر غریب بھی تو آخر انسان ہی ہیں۔!!

●●

بزرگ ادیب جناب خان غازی کابلی مرحوم اور جناب شہزادۂ تبسم کی تخلیقات کے ساتھ جناب ہرچند کوشک کی کچھ کہانیاں کچھ رسائل میں کافی دیر پہلے نظر سے گذری تھیں۔ اتفاقاً دورانِ ملازمت ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کام کرنے اور ادبی ذوق جاننے کا موقع ملا۔ ہمارے مشترکہ دوست بھائی نند لال چھابڑہ مرحوم نے ان کی کچھ دیمک زدہ کہانیاں ڈھونڈ نکالیں اور انہیں دوبارہ قلم پکڑنے پر مجبور کر دیا۔ "کھوٹا سکہ۔ بے آواز لاٹھی۔ سُرمئی چاند۔ جلتا ہوا شہر" اور کئی دوسری کہانیاں بہت اچھی ہیں "ہندوستانی ہونے کا فخر" کے عنوان والی کہانی نے تو من ہی جیت لیا۔ اس مجموعہ کی ہر کہانی سماج کے لئے ایک پیغام دے رہی ہے۔ حقائق کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی نشتر سماج کے جسم سے گندے مواد کو خارج کر کے صحت مندی کی طرف لے جاتی نظر پڑتی ہے۔ ان کی زبان سلیس شستہ اور عام فہم ہے۔ اکثر افسانوں کے پلاٹ عوام اور نچلے طبقے سے لئے گئے ہیں۔ وہ ہمارے منچ کے ایک معزز رکن ہیں۔ منچ کو اس بات کا بجا ناز ہے کہ ہریانہ اُردو اکاڈمی نے انہیں ان کی ادبی خدمات کے لئے پنڈت سُرندر سوز ایوارڈ سے نوازا۔ خدا انہیں اور زورِ قلم اور جادو بیانی عطا کرے۔

——— ڈاکٹر ملکھی رام کشتان

پردھان انبالہ ساہتیہ منچ

ملک کے جانے مانے افسانہ نگار جناب مہر چند کوشک گذشتہ چالیس برسوں سے "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" کے مصداق اُردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اُن کے متعدد افسانے ملک کے مؤقر رسائل و جرائد اور کثیر الاشاعت روزناموں میں اشاعت پذیر ہو کر قبولیت خواص و عوام کا شرف حاصل کرتے رہے ہیں جناب مہر چند کوشک اب اپنے چند افسانوں کو "ادھار کی زندگی" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں۔ اس کے لئے بھی انھوں نے مالی امداد کے لئے کسی سرکاری ادارے کا مرہون ہونا پسند نہیں کیا۔

تقسیم وطن کے بعد تقریباً دو برس تک میرا قیام انبالہ چھاؤنی میں رہا۔ اپنے اس قیام کے دوران میں نے اپنے دو دوستوں لالہ دیپ چند جین اور شری بُدھ رام کے تعاون سے اُردو اور ہندی کے دو ماہناموں کا اجرا کیا، جو بیحد مشہور و مقبول ہوئے۔ اسی زمانہ میں میرا تعارف جناب مہر چند کوشک سے ہُوا، اور مجھے ان کے کلکِ جادو نگار کی نیرنگیوں سے لُطف اندوز ہونے کا موقع بھی میسّر ہُوا۔ ازاں بعد میں انبالہ سے دہلی آگیا جناب مہر چند کوشک کو میں نے آہستہ آہستہ ترقی کی منازل کی جانب گامزن ہوتے اور شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچتے دیکھا ہے۔ افسانہ نگاری میں کوشک صاحب نے تقلیدی روش کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ وہ اس فن میں نہ تو منٹو سے متاثر ہو کر رنگین نویس ہوئے اور نہ ہی منشی تیرتھ رام فیروزپوری کے جاسوسی رنگ کی جانب راغب ہوئے۔ انھوں نے اپنی منفرد روش اختیار کی، اپنے رنگ میں ہی لکھتے رہے اور خوب لکھتے رہے۔ آج وہ فنِ افسانہ نگاری میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

ان کی یہ تازہ تصنیف "ادھار کی زندگی" پڑھ کر آپ میرے خیال کی تائید کئے بغیر نہیں رہیں گے میرا دعویٰ ہے کہ جب تک آپ اس تصنیف میں شامل سارے افسانے ختم نہ کر لیں گے اُس وقت تک اسے ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے۔

جناب کوشک صاحب زندگی کی آخری منزلوں سے گزر رہے ہیں اور اُن کے کلکِ جادو نگار کی گہر افشانی بدستور جاری و ساری ہے۔ میں خدا سے دُعا گو ہوں کہ وہ انھیں صحت و توانائی عطا فرمائے تاکہ وہ بدستور گیسوئے اُردو کو سنوارتے رہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی دُعا کرتا ہوں کہ: ع — "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔

مجھے اُمید ہی نہیں بلکہ یقین واثق ہے کہ کوشک صاحب کی اس گراں مایہ تصنیف "ادھار کی زندگی" کو ادبی حلقوں میں وہی مقام حاصل ہو سکے گا جو منشی پریم چند کی کتاب "پریم بتیسی" کو حاصل ہے۔

اوم پرکاش ناجی

ایڈیٹر روزنامہ "تیج" دہلی

تخلیق کار پبلیشرز، ۷۷/۹، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲